خواب و خیال

مُصنّفہ

عدیم المثال منشی پریم چند

پبلشرز

لاجپت رائے اینڈ سنز تاجران کتب

لوہاری دروازہ - لاہور

چوتھی بار　　سنہ ۱۹۴۳ء　　مجلد قیمت عہ

۱۸۱۹ء

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور

باہتمام پرنٹر و پبلشر
سوم پرکاش ساہنی
نے لوک آریہ ادارہ لاہور سے شائع کی۔

ख़्वाबीख़्याल



خواب و خیال کی کہانیاں

نخلِ اُمیّد

راجہ اندر ناتھ کا انتقال ہو جانے کے بعد کنور راج ناتھ کو دشمنوں نے چاروں طرف سے ایسا دبایا کہ انہیں اپنی جان بچا کر ایک اپنے دیرینہ خادم کے یہاں پناہ گزین ہونا پڑا جو ایک چھوٹے سے گاؤں کا جاگیر دار تھا۔ کنور فطرتاً امن پسند، شعریت کے دلدادہ، ہنس کھیل کر وقت گزارنے والے نوجوان تھے۔ میدانِ جنگ کی بہ نسبت فضائے شعریت میں اپنا کمال دکھانا اُنہیں زیادہ مرغوب تھا۔ سخن نواز احباب کے ساتھ، کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے شعر و سخن کی گفتگو کرتے ہوئے اُن میں جو حظ حاصل ہوتا تھا وہ شکار یا شاہی دربار میں نہیں۔ اِس پہاڑوں سے گھرے ہوئے گاؤں میں آکر انہیں جس سکون و سرور کا احساس ہُوا۔ اُس کے عوض وہ ایسے کئی کئی راج ملک کر سکتے تھے یہ پہاڑوں کی دلکش فضا، یہ نظر فریب سبزی، یہ دریائے رواں کا نغمۂ شیریں۔ یہ پرندوں کی دلکش آوازیں۔ یہ ہرن کے بچوں کی چھلانگیں۔ یہ دیہاتیوں کی طفلانہ سادگی، یہ عورتوں کی محجوب شوخی۔ یہ سبھی باتیں اُن کے لئے نئی تھیں۔ مگر ان سبھوں سے بڑھ کر جو چیز ان کو اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ وہ جاگیر دار کی نوجوان لڑکی چندا تھی۔

چندا گھر کا سارا کام کاج خود ہی کرتی تھی۔ اس کو ماں کی گودی کھیلنا نصیب

ہی نہ ہوا تھا۔ باپ کی خدمت گذاری میں ہی مصروف رہتی تھی۔ اس کی شادی اسی سال ہونے والی تھی۔ کہ اسی درمیان میں کنور نے آکر اس کی زندگی میں نئے جذبات اور نئی امیدوں کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے اپنے شوہر کی جو خیالی تصویر اپنے دل میں کھینچ رکھی تھی۔ وہی گویا مجسم ہوکر اس کے سامنے آگئی تھی۔ ساتھ ہی کنور کی خیالی محبوبہ بھی چندا ہی کی شکل میں آموجود ہوتی تھی۔ لیکن کنور سمجھتے تھے، میرے ایسے نصیب کہاں! چندا بھی سمجھتی تھی، کہاں یہ اور کہاں میں؟

۲

دوپہر کا وقت تھا اور جیٹھ کا مہینہ کھپریل کا مکان بھٹی کی طرح جلنے لگا جس کی ٹٹیوں اور تہ خانوں میں رہنے والے راج کنور کی طبیعت گرمی سے اس قدر پریشان ہوئی کہ وہ باہر نکل آئے اور سامنے کے باغ میں جاکر ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔ دفعتاً انھوں نے دیکھا کہ چندا ندی سے پانی کا گھڑا لئے ہوئے چلی آرہی ہے۔ نیچے جلتی ہوئی ریت تھی، اوپر جلتا ہوا سورج۔ لو سے بدن جھلسا جاتا تھا۔ شاید اس وقت پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی بھی ندی تک جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ چندا کیوں پانی لینے گئی تھی؟ گھر میں پانی موجود ہے، پھر اس وقت وہ کیوں پانی لینے نکلی؟

کنور دوڑکر اس کے پاس جا پہنچے۔ اور اس کے ہاتھ سے گھڑا چھین لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ مجھے دے دو اور بھاگ کر سایہ میں چلی جاؤ۔ اس وقت پانی کا کیا کام تھا؟

چندا نے گھڑے کو نہ چھوڑا۔ سر سے کھسکا ہوا آنچل سنبھال کر بولی تم اس وقت

کیسے آ گئے ؟ شاید گرمی کے سبب اندر نہ رہ سکے۔

کنور۔ مجھے دے دو۔ ورنہ میں چھین لوں گا۔

چندا نے مُسکرا کر کہا۔ راجکماروں کو گھڑا لے کر چلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

کنور نے گھڑے کا منہ پکڑ کر کہا۔ اس قصور کی کافی سزا بھگت چکا ہوں چندا !

اب تو اپنے آپ کو راج کنور کہنے میں بھی شرم معلوم ہوتی ہے !

چندا دیکھو دھوپ میں خود پریشان ہوتے ہو اور مجھے بھی پریشان کرتے ہو۔ گھڑا چھوڑ دو۔ سچ کہتی ہوں۔ یہ پانی پُوجا کے لئے ہے۔

کیا میرے لے جانے سے پُوجا کا پانی نجس ہو جائیگا ؟

اچھا بھائی نہیں مانتے تو تمہیں لے چلو۔ ہاں، یہیں تو ؛

کنور گھڑا لے کر آگے آگے چلے اور چندا پیچھے پیچھے۔ باغیچہ میں پہنچے۔ تو چندا ایک چھوٹے سے پودے کے پاس رُک کر بولی۔ اسی دیوتا کی پُوجا کرنی ہے۔ گھڑا رکھ دو۔

کنور نے تعجب سے پوچھا۔ یہاں کون دیوتا ہے ؟ مجھے تو نہیں نظر آتا۔

چندا نے پودے کو سینچتے ہوئے کہا۔ یہی تو میرا دیوتا ہے !

پانی پڑنے سے پودے کی مُرجھائی ہوئی پتیاں ہری ہو گئیں۔ گویا اسکی آنکھیں کھُل گئی ہوں۔

کنور نے پوچھا۔ یہ پودا کیا تُم نے لگایا ہے چندا ؟

چندا نے پودے کو ایک سیدھی لکڑی سے باندھتے ہوئے کہا۔ ہاں اُسی دن تو جب تُم یہاں آتے۔ یہاں پہلے میری گڑیوں کا گھروندا تھا۔ میں نے گڑیوں پر سایہ

کی غرض سے ایک امولا لگا دیا تھا۔ پھر مجھے اس کی یاد نہ رہی گھر کے کام دھندوں میں بھول گئی جس دن تم یہاں آئے۔ مجھے نہ جانے کیوں اس پودے کی یاد آ گئی۔ میں نے آ کر دیکھا تو یہ خشک ہو گیا تھا۔ میں نے فوراً پانی لا کر اس کو سینچا تو کچھ کچھ تازگی آ گئی۔ تب سے روزانہ اسے سینچتی ہوں۔ دیکھو کتنا سرسبز ہو گیا ہے۔

یہ کہتے کہتے اُس نے سر اُٹھا کر کنور کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ اور سب کام بھول جاؤں۔ پر اس پودے کو پانی دینا نہیں بھولتی۔ تمہیں اس کے پران داتا ہو۔ تمہیں نے آ کر اس کو جلا دیا۔ ورنہ بیچارہ سوکھ ہی گیا تھا۔ یہ تمہارے خوش آمدید کی یادگار ہے ذرا اسے دیکھو تو، معلوم ہوتا ہے ہنس رہا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے سچ کہتی ہوں کبھی یہ روتا ہے، کبھی ہنستا ہے کبھی روٹھتا ہے۔ آج تمہارا لایا ہوا پانی پا کر پھولا نہیں سماتا۔ ایک ایک پتہ تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہے۔

کنور کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ پودا کوئی ننھا سا کھیلتا ہوا بچہ ہے جیسے چُمنے سے خوش ہو کر کوئی بچہ گودی میں آنے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے اسی طرح یہ پودا بھی ہاتھ پھیلاتا ہوا معلوم ہوا۔ اس کے ایک ایک رگ و ریشہ میں چندا کی محبت جھلک رہی تھی۔

چندا کے گھر میں کشاورزی کے سبھی آلات تھے۔ کنور ایک پھاوڑا اُٹھا لائے اور پودے کا ایک تھالا بنا کر اس کے گرد ایک مینڈ قائم کر دی۔ پھر کھرپی لے کر اندر کی مٹی کو گوڑ دیا۔ پودا اور بھی لہلہا اٹھا۔

چندا بولی۔ کچھ سنتے ہو؟ کیا کہہ رہا ہے؟

کنور نے مسکرا کر کہا۔ ہاں کہتا ہے۔ کہ اماں کی گود میں بیٹھوں گا۔

چندا نہیں! کہہ رہا ہے کہ اتنی محبت کر کے پھر بھول نہ جانا۔

۳

مگر کنور کے لئے ابھی شاہزادہ ہونے کی سزا بھگتنی باقی تھی۔ دشمنوں کو نہ جانے کیسے ان کا سراغ لگ گیا۔ اِدھر تو خیر خواہوں کے اصرار سے مجبور ہو کر بوڑھا کبیر سنگھ چندا اور کنور کے بیاہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اُدھر حریفوں کا ایک دستہ سر پر آ پہنچا۔ کنور نے اس پودے کے آس پاس پھول پتے لگا کر ایک پھلواڑی سی سجا دی تھی۔ پودے کو سینچنا ان کا کام تھا۔ علی الصبح وہ کندھے پر کانور رکھے ندی سے پانی لا رہے تھے کہ دس بارہ آدمیوں نے انہیں راستہ میں گھیر لیا۔ کبیر سنگھ تلوار لے کر دوڑا۔ مگر دشمنوں نے اسے مار گرایا۔ تنہا غیر مسلح کنور کیا کرتا۔ کندھے پر کانور رکھے ہوا بولا۔ اب کیوں میرے پیچھے پڑے ہو بھائی؟ میں نے تو سب کچھ چھوڑ دیا۔

سردار بولا "ہمیں آپ کو پکڑ لے جانے کا حکم ہے"۔

کنور۔ "تمہارا آقا مجھے اس حالت میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خیر اگر دھرم سمجھو۔ تو کبیر سنگھ کی تلوار مجھے دے دو۔ کہ اپنی آزادی کے لئے لڑ کر مر جاؤں"۔

اس کا جواب یہی ملا کہ سپاہیوں نے کنور کو پکڑ کر ان کی مشکیں باندھ دیں اور پھر اُنہیں ایک گھوڑے پر بٹھا کر گھوڑے کو بھگا دیا۔ کانور وہیں پڑی رہ گئی۔

اُسی وقت چندا گھر میں سے نکلی۔ دیکھا کہ کانور پڑی ہوئی ہے۔ اور کنور کو لوگ گھوڑے پر بٹھاتے لئے جا رہے ہیں۔ چوٹ کھائے ہوئے پرندکی طرح وہ کئی قدم دوڑی پھر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

دفعتاً اُس کی نظر باپ کی نعش پر پڑی۔ وہ گھبرا کر اُٹھی اور نعش کے پاس جا پہنچی کبیر ابھی مرا نہ تھا۔ جان آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ چندا کو دیکھتے ہی نہایت کمزور لہجہ میں بولا "بیٹی کنور" اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ جان نکل گئی۔ مگر "کنور" کے ایک لفظ نے اس کا مطلب ظاہر کر دیا۔

۴

بیس سال گذر گئے۔ کنور قید سے رہائی نہ پا سکے۔

یہ ایک پہاڑی قلعہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی، پہاڑیاں نظر آتی تھیں قلعہ میں انہیں کوئی تکلیف نہ تھی، نوکر چاکر، کھانا کپڑا۔ سیر و شکار، کسی بات کی کمی نہ تھی مگر اُس جدائی کی آگ کو کون ٹھنڈی کرتا۔ جو ہر وقت کنور کے دل میں جلا کرتی تھی۔ اب اُنکی زندگی میں کوئی اُمید نہ تھی۔ کوئی اُجالا نہ تھا۔ اگر کوئی خواہش تھی۔ تو صرف یہی کہ ایک بار اس محبت کے تیرتھ کی یاترا کر لیں۔ جہاں انہیں وہ سب کچھ ملا جو انسان کو مل سکتا ہے ہاں ان کے دل میں صرف یہی ایک خواہش تھی کہ اس پاک یادگاروں سے معمورہ سرزمین کی زیارت کر کے اپنی زندگی کا اسی ندی کے کنارے خاتمہ کر دیں۔ وہی ندی کا کنارہ، وہی درختوں کا کنج، وہی چندا کا چھوٹا سا خوبصورت مکان ان کی نگاہوں میں پھرا کرتا، اور وہ پودا جسے ان دونوں نے مل کر سینچا تھا۔ اس میں تو گویا اُس کی جان ہی تھی۔ کیا وہ دن بھی آئیگا۔ جب وہ اُس پودے کو سرسبز پتیوں سے آراستہ دیکھیگا؟ کون جانے، وہ اب ہے بھی یا خشک ہو گیا۔ کون اب اس کو سینچتا ہوگا؟ چندا اتنے دنوں تک بے بیاہی تھوڑا ہی بیٹھی ہوگی۔ ایسا ممکن بھی تو نہیں۔ اُسے اب میری یاد بھی نہ ہوگی۔ ہاں شاید کبھی اس کو اپنے گھر کی یاد کھینچ لاتی ہو تو پودے کو دیکھکر اُسے

میری یاد آ جاتی ہو۔ مجھ جیسے بدنصیب کے لئے اس سے زیادہ وہ اور کر ہی کیا سکتی ہے
اُس سرزمین کو وہ ایک بار دیکھنے کے لئے اپنی زندگی دے سکتا تھا۔ مگر اس کی یہ خواہش
پوری نہ ہوتی تھی۔

آہ ایک زمانہ گذر گیا۔ غم و یاس نے اُمڈتی ہوتی جوانی کو کچل ڈالا نہ آنکھوں میں
روشنی رہی اور نہ پیروں میں طاقت۔ زندگی کیا تھی ایک رنج افزا خواب تھا۔ اس گھنی
تاریکی میں اُس کو کچھ نہ سُوجھتا تھا۔ بس زندگی کا سہارا ایک خواہش تھی ایک خوش
کُن خواب، جسے زندگی میں نہ جانے اُس نے کب دیکھا تھا۔ ایک بار پھر وہی خواب دیکھنا
چاہتا تھا۔ پھر اس کی خواہشوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اُسے کوئی حسرت نہ رہے گی۔ سارا
غیر محدود مستقبل، ساری لاانتہا حسرتیں، اسی ایک خواب میں جذب ہو جاتی تھیں۔

اُس کے محافظوں کو اب اس کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا انہیں اس پر
رحم آتا تھا۔ رات کو پہرہ پر صرف کوئی ایک شخص رہ جاتا اور لوگ میٹھی نیند سوتے تھے۔ کنور
بھاگ جا سکتا ہے۔ اس کا کوئی امکان، کوئی اندیشہ نہ تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز یہ
ایک پہرہ دار بھی بے فکر ہو کر بندوق لئے لیٹ رہا۔ گویا کسی خونخوار درندہ کی طرح تاک لگائے
بیٹھی تھی۔ لیٹتے ہی ٹوٹ پڑی۔ کنور نے سپاہی کے خراٹے سُنے۔ اُن کا دل تیزی سے
اُچھلنے لگا۔ یہ موقع آج کتنے دنوں کے بعد ملا تھا۔ وہ اُٹھے۔ مگر پاؤں تھر تھر کانپ رہے
تھے۔ برآمدہ کے نیچے قدم رکھنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ کہیں اُس کی نیند کھل گئی تو؟ تشدد
ان کی مدد کر سکتا تھا۔ سپاہی کی بغل میں اُس کی تلوار پڑی تھی۔ مگر محبت کو تشدد سے عداوت
ہے۔ کنور نے سپاہی کو جگا دیا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ رہا سہا اندیشہ بھی اُس کے دل سے
جاتا رہا۔ دوسری بار جو سویا تو اور بھی زور سے خراٹے بھرنے لگا۔

علی الصبح جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس نے لپک کر کنور کے کمرہ میں جھانکا کنور کا پتہ نہ تھا۔

کنور اُس وقت ہوا کے گھوڑوں پر سوار، خیال کی تیزی کے ساتھ بھاگا جا رہا تھا اُس مقام کو جہاں اُس نے مسرت کا خواب دیکھا تھا۔

قلعہ میں چاروں طرف تلاش ہوئی۔ افسر نے سوار دوڑائے۔ مگر کنور کا کہیں پتہ نہ تھا۔

۵

پہاڑی راستوں کا طے کرنا مشکل، اس پر نامعلوم مقام کی قید موت کے فرشتے پیچھے لگے ہوئے جن سے بچنا دشوار، کنور کو منزل مقصود تک پہنچنے میں مہینوں لگ گئے۔ جب سفر پورا ہوا تو کنور میں ایک خواہش کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا تھا۔ دن بھر کی مسافت کے بعد جب وہ اس مقام پر پہنچے تو شام ہو گئی تھی۔ وہاں بستی کا نام بھی نہ تھا البتہ دو چار ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے اس بستی کے نشان کی صورت میں باقی رہ گئے تھے وہ جھونپڑا جس میں کبھی محبت کا اجالا تھا جس میں انہوں نے زندگی کی مسرت بھری گھڑیاں کاٹی تھیں، جو اُن کی تمناؤں کا مرکز اور اُن کی پوجا کا مندر تھا۔ اب اُن کے دل کی طرح ویران ہو گیا تھا۔ جھونپڑے کی ویرانی خاموش زبان میں اپنی رقت بھری داستان سنا رہی تھی۔ کنور اُسے دیکھتے ہی "چندا چندا" پکارتا ہوا دوڑا۔ اُس نے وہاں کی خاک کو ماتھے پر لگایا۔ گویا کسی دیوتا کی بھبھوت ہو، اور اُس کی شکستہ دیواروں سے لپٹ کر بڑی دیر تک روتا رہا۔ ہائے اے تمنا! وہ رونے ہی کے لئے اتنی دُور سے یہاں آیا تھا، رونے ہی کی تمنا اس کو اتنے دنوں سے بیتاب کر رہی تھی مگر اس رونے میں کتنا بہشت کا

سرور تھا۔ کیا گُل دُنیا کا شکھ اِن آنسوؤں کی برابری کر سکتا تھا؟

پھر وہ جھونپڑے سے نکلا۔ سامنے میدان میں ایک درخت، سرسبز پتوں کو گود میں لئے گویا اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ یہ وہی پودا ہے جسے آج سے بیس سال قبل اُن دونوں نے نصب کیا تھا۔ کنور دیوانہ وار دوڑا اور جاکر درخت سے لپٹ گیا، گویا کوئی باپ اپنے بے ماں کے بچے کو سینہ سے لگاتے ہوتے ہو۔ وہ اسی محبت کی نشانی ہے۔ اسی لازوال محبت کی جو اتنے دنوں کے بعد آج اِس قدر بڑھ گئی ہے۔ کنور کا دل ایسا شگفتہ ہو گیا۔ گویا وہ اس درخت کو اپنے اندر رکھ لے گا۔ کہ اسے ہوا کا جھونکا بھی نہ لگے۔ اس کے ایک ایک پتے پر چنپا کی یاد منقش تھی۔ چڑیوں کا اتنا سہانا گیت کیا اس نے کبھی سنا تھا؟ اس کے ہاتھوں میں سکت نہ تھی۔ سارا بدن بھوک۔ پیاس اور تکان سے مضمحل ہو رہا تھا مگر وہ اُس درخت پر چڑھ گیا اس قدر تیزی سے کہ بندر بھی نہ چڑھتا۔ سب سے اونچی شاخ پر بیٹھ کر اس نے چاروں طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھا یہی اس کی اُمیدوں کا بہشت تھا۔ سارے منظر میں چنپا ہی چنپا تھی۔ دُور کی نیلگوں پہاڑیوں پر چنپا بیٹھی گا رہی تھی، آسمان پر تیرنے والی سرخ کشتیوں میں چنپا ہی بیٹھی اُڑی جا رہی تھی۔ آفتاب کی سفید زرد شعاعوں پر چنپا ہی بیٹھی ہنس رہی تھی۔ کنور نے یہ خیال کیا کہ پرند ہوتا تو انہیں شاخوں پر بیٹھا ہوا زندگی کے دن گزار دیتا۔

جب اندھیرا ہو گیا تو کنور نیچے اُترا اور اُسی درخت کے نیچے تھوڑی سی زمین صاف کر کے پتوں کا بستر لگایا اور اسی پر پڑ رہا۔ یہی اس کی زندگی کا بہشتی خواب تھا۔ آہ، یہی ترک دُنیا! اب وہ اس درخت کا دامن چھوڑ کر اور کہیں نہ جائیگا۔ دہلی کے تخت کے لئے بھی وہ اس جگہ کو نہ چھوڑے گا۔

۶

اُسی خوشنما اور صاف چاندنی میں دفعتاً ایک چڑیا آکر اس درخت پر بیٹھ گئی اور درد بھری آواز میں گانے لگی۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ درخت سر دھن رہا ہے وہ پُر سکوت رات اس درد بھرے راگ سے ہل اُٹھی، کنور کا دل اس طرح پیچ و تاب کھانے لگا گویا وہ شق ہو جاتے گا۔ اُس آواز میں درد اور فراق کے تیر سے بھرے ہوتے تھے۔ آہ، چڑیا تیرا جوڑا ابھی ضرور بچھڑ گیا ہے۔ ورنہ تیری آواز میں اتنا درد، اتنا سوز۔ اتنا شیون کہاں سے آتا۔ کنور کے دل کے ٹکڑے ہو جاتے تھے۔ ایک ایک راگ تیر کی طرح دل کو چھید ڈالتا تھا۔ وہاں بیٹھے نہ رہ سکے۔ اُٹھ کر ایک بیخودی کی حالت میں دوڑتے ہوتے جھونپڑے میں گئے۔ وہاں سے پھر درخت کے نیچے آتے۔ اُس چڑیا کو کیسے پائیں کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

چڑیتے کا گانا بند ہُوا تو کنور کو نیند آگئی۔ انہیں خواب میں ایسا معلوم ہُوا۔ کہ وہی چڑیا اُن کے پاس آئی۔ کنور نے غور سے دیکھا تو وہ چڑیا نہ تھی۔ چندا تھی مجسم چندا تھی۔

کنور نے پوچھا۔ چندا، یہ چڑیا یہاں کہیں سے آئی؟

چندا نے کہا۔ میں ہی تو وہ چڑیا ہوں۔

کنور۔ تم چڑیا ہو۔ کیا تمہیں گا رہی تھیں؟

چندا ہاں پیارے میں ہی گا رہی تھی۔ اسی طرح روتے ایک زمانہ گذر گیا۔

کنور۔ تمہارا گھونسلا کہاں ہے؟

چندا۔ اسی جھونپڑے میں جہاں تمہارا پلنگ تھا۔ اس پلنگ کے بان میں

میں اپنا گھونسلا بنایا ہے۔

کنور۔ اور تمہارا جوڑا کہاں ہے؟

چندا میں اکیلی ہوں۔ چندا کو اپنے پیارے کو یاد کرنے اور اس کے لئے رونے میں جو سکھ ہے وہ جوڑے میں نہیں میں اکیلی اسی طرح رہونگی اور اکیلی مرونگی۔

کنور۔ میں کیا چڑیا نہیں ہو سکتا؟

چندا چلی گئی۔ کنور کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کی سرخی آسمان پر پھیلی ہوئی تھی اور وہ چڑیا کنور کی آرام گاہ کے قریب ایک شاخ پر بیٹھی ہوئی چہک رہی تھی اب اس میں فغاں نہ تھی، فریاد نہ تھی۔ اس میں سرور تھا، شوخی تھی۔ حظ تھا، وہ فراق کی گریہ و زاری نہیں۔ وصال کا نغمۂ شیریں تھا۔

کنور سوچنے لگا۔ اس خواب میں کیا راز ہے۔



کنور نے بستر سے اٹھتے ہی ایک جھاڑو بنایا۔ اور اس جھونپڑے کو صاف کرنے لگے۔ ان کے جیتے جی اس کی یہ تباہ حالت نہیں رہ سکتی۔ وہ اس کی دیواریں اٹھائیں گے۔ اس پر چھپر ڈالیں گے۔ اسے لیپیں گے۔ اس میں ان کی چندا کی یادگار موجود ہے جھونپڑے کے ایک گوشہ میں وہ کانور رکھی ہوئی تھی جس پر وہ پانی لالاکر اس درخت کو سینچتے تھے۔ انہوں نے کانور اٹھالی اور پانی لانے چلے۔ دو روز سے کچھ نہ کھایا تھا۔ رات کو بھوک معلوم ہوئی تھی۔ مگر اس وقت کھانے کو بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ بدن میں ایک عجیب جذبہ کا احساس ہوتا تھا۔ انہوں نے ندی سے پانی لا لاکر مٹی بھگونی شروع کی دوڑتے ہوئے جاتے تھے اور دوڑتے ہوئے آتے تھے اتنی سکت

ان میں کبھی نہ تھی۔

ایک ہی دن میں دیوار اُٹھ گئی۔ جتنی چار مزدور بھی نہ اُٹھا سکتے تھے! وہ کتنی سیدھی چکنی دیوار تھی کہ معمار بھی دیکھ کر خجل ہو جاتا۔ محبت کی طاقت غیر محدود ہے۔

شام ہو گئی۔ چڑیوں نے بسیرا لیا۔ درختوں نے بھی آنکھیں بند کیں۔ مگر کنور کو آرام کہاں۔ تاروں کی مدہم روشنی میں مٹی کے روڑے رکھے جا رہے تھے۔ ہائے ری اُمید کیا تُو اِس بیچارے کی جان ہی لے کر چھوڑے گی؟"

درخت پر چڑیا کا میٹھا راگ سُنائی دیا۔ کنور کے ہاتھ سے گھڑا چھوٹ پڑا ہاتھ اور پیروں میں مٹی لپیٹے وہ درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ اِس راگ میں کتنی دلکشی تھی، کتنی خوشی، کتنی چمک۔ انسانی نغمہ اس کے آگے ایک بے سُرا الاپ تھا۔ اس میں یہ بیداری یہ تحریک، یہ زندگی کہاں؟ نغمہ کے سرور میں غفلت ہے۔ مگر وہ غفلت کتنی یاد افزا ہوتی ہے۔ ماضی کو زندگی اور روشنی سے مزیّن کر کے علانیہ دکھا دینے کی طاقت بجز نغمہ کے اور کس میں ہے؟ کنور کی نگاہ تصور کے سامنے وہ منظر آموجود ہوا۔ جب چندرا اسی پودے کو ندی سے پانی لا لا کر سینچتی تھی۔ آہ، کیا وہ دن پھر آسکتے ہیں؟

دفعتاً ایک مسافر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کنور کو دیکھ کر ایسے سوالات کرنے لگا۔ جو عموماً دو ناشناسوں میں ہوا کرتے ہیں؟ کون ہو؟ کہاں سے آتے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ پہلے بھی وہ اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ مگر جب گاؤں اُجڑ گیا تو قریب کے ایک دوسرے گاؤں میں جا بسا تھا۔ اس کے کھیت اب بھی یہاں تھے۔ رات کو جنگلی جانوروں سے اپنے کھیتوں کی حفاظت کرنے کے لئے وہ یہیں آ کر سوتا تھا۔

کنور نے پوچھا۔ تمہیں معلوم ہے۔ اس گاؤں میں ایک کبیر سنگھ ٹھاکر رہتے تھے

کسان نے جوش کے لہجہ میں کہا۔ ہاں ہاں بھائی جانتا کیوں نہیں بیچارے یہیں تو مارے گئے۔ تم سے کیا ان کی جان پہچان تھی؟

کنور۔ ہاں ان دنوں کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ میں بھی راجہ کی فوج میں نوکر تھا۔ ان کے گھر میں اور کوئی نہ تھا؟

کسان۔ ارے بھائی کچھ نہ پوچھو۔ بڑی دُکھ بھری کہانی ہے۔ ان کی بیوی تو پہلے ہی مر چکی تھی صرف لڑکی باقی تھی۔ آہ، کیسی اچھی، کیسی نیک مزاج وہ لڑکی تھی۔ اُسے دیکھ کر آنکھوں میں نور آجاتا تھا۔ بالکل بیکنٹھ کی دیوی معلوم ہوتی تھی جب کبیر سنگھ زندہ تھا۔ اُسی وقت کنور اندرناتھ یہاں بھاگ کر آتے تھے اور اُسی کے یہاں رہتے تھے۔ اس لڑکی کی کنور سے کچھ بات چیت ہوگئی۔ جب کنور کو دشمنوں نے پکڑ لیا۔ تو چندا گھر میں اکیلی رہ گئی۔ گاؤں والوں نے بہت چاہا۔ کہ اس کا بیاہ ہو جاوے۔ اس کے لئے بیاہنے والوں کی کمی نہ تھی، بھائی ایسا کون تھا۔ جو اُسے پاکر اپنے بھاگ کو نہ سراہتا۔ مگر وہ کسی سے بیاہ کرنے پر راضی نہ ہوئی۔ یہ درخت جو تم دیکھ رہے ہو۔ اس وقت چھوٹا سا پودہ تھا۔ اس کے گرد پھولوں کی کئی اور کیاریاں بھی تھیں۔ انہیں گوڑنے۔ نرانے۔ سینچنے میں اُس کا دن کٹتا تھا۔ بس یہی کہتی، کہ ہمارے کنور صاحب آتے ہونگے۔

کنور کی آنکھوں سے آنسوؤں کا پرنالہ بہنے لگا۔ مسافر نے ذرا دم لے کر کہا۔ روز بروز گھلتی جاتی تھی تمہیں یقین نہ آئے گا۔ بھائی اُس نے دس برس اسی طرح گذار دیئے۔ اتنی کمزور ہوگئی تھی۔ کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ مگر اب بھی اُسے کنور صاحب کے آنے کی آس بندھی ہوتی تھی۔ آخر ایک روز اسی درخت کے نیچے اُس کی لاش ملی۔ ایسی محبت کون کریگا بھائی؟ کنور نہ جانے مرے کہ جیتے کبھی اُنہیں اس برہ کی ماری ہوئی

کی یاد بھی آتی ہے یا نہیں، مگر اُس نے تو محبت کو ایسا نبا ہا جیسا کہ چاہتے۔
کنور کو ایسا معلوم ہُوا گویا دل دو نیم ہُوا جا رہا ہے۔ وہ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ مسافر کے ہاتھ میں ایک سُلگتا ہُوا اوپلا تھا۔ اُس نے چلم بھری اور دو چار کش لے کر بولا :-

اِس کے مرنے کے بعد یہ گھر گر گیا۔ گاؤں پہلے ہی اُجاڑ تھا۔ اب تو بھی اور سنسان ہو گیا۔ دو چار آسامی یہاں آ بیٹھتے تھے۔ اب تو چڑیے کا پوت بھی یہاں نہیں آتا۔ اِس کے مرنے کے کئی مہینے بعد یہی چڑیا اس پیڑ پر بولتی ہوئی سُنائی دی۔ تب سے برابر اسے یہاں بولتے سُنتا ہوں۔ رات کو سبھی چڑیاں سو جاتی ہیں۔ یہ رات بھر بولتی رہتی ہے اِس کا جوڑا کبھی نہیں دکھائی دیا۔ بس اکیلی ہے۔ دن بھر اسی جھونپڑے میں پڑی رہتی ہے۔ رات کو اس پیڑ پر آ بیٹھتی ہے۔ مگر اس وقت اس کے گانے میں کچھ اور ہی بات ہے۔ ورنہ سُن کر رونا آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا کوئی کلیجے کو مسوس رہا ہے میں تو کبھی کبھی پڑے رو دیا کرتا ہوں۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ وہی چندا ہے، اب بھی کنور کی جدائی میں الاپ کر رہی ہے۔ مجھے بھی ایسا معلوم پڑتا ہے آج نہ جانے کیوں خوش ہے۔
کسان تمباکو پی کر سو گیا۔ کنور کچھ دیر تک بیخود سا کھڑا رہا پھر آہستہ سے بولا :-
چندا کیا سچ مچ تمہیں ہو۔ میرے پاس کیوں نہیں آتیں۔
ایک لمحہ میں چڑیا آ کر اُس کے ہاتھ پر بیٹھ گئی۔ چاندنی روشنی میں کنور نے چڑیا کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہُوا۔ گویا اُس کی آنکھیں کھل گئی ہوں۔ گویا آنکھوں کے سامنے سے کوئی پردہ ہٹ گیا ہے۔ چڑیا کی شکل میں بھی چندا کی صورت نمایاں تھی۔

دوسرے روز کسان سو کر اُٹھا تو کنور کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

۸

کنور اب نہیں ہیں مگر ان کے جھونپڑے کی دیواریں بن گئی ہیں۔ اُوپر پھُوس کا نیا چھپّر پڑ گیا ہے اور جھونپڑے کے دروازے پر پھولوں کی کتّی کیاریاں لگی ہوئی ہیں۔ گاؤں کے کسان لوگ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔

اِس جھونپڑے میں اب چڑیوں کے ایک جوڑے نے اپنا گھونسلا بنایا ہے دونوں ساتھ ساتھ دانے چارے کے کھوج میں جاتے ہیں۔ اور ساتھ ساتھ آتے ہیں اُنکو دونوں اُسی درخت کی شاخ پر بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا دلکش نغمہ رات کے سناٹے میں دُور تک سنائی دیتا ہے۔ یہ چڑیوں کا جوڑا کنور اور چندا کا جوڑا ہے۔ اِس میں کسی کو شک نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ایک بہیلیے نے اِن چڑیوں کو پھنسانا چاہا۔ مگر گاؤں والوں نے اُسے مار کر بھگا دیا۔

نوک جھونک

بیوی

مَیں درحقیقت بدنصیب ہوں ورنہ کیوں مجھے روز ایسے نفرت انگیز مناظر دیکھنے پڑتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ مجھے صرف دیکھنے ہی نہیں پڑتے بلکہ بدنصیبی نے انکو میری زندگی کا جزوِ خاص بنا دیا ہے۔ مَیں اُس عالی ظرف برہمن کی لڑکی ہوں جس کا احترام بڑی بڑی ہندو مذہبی سوسائیٹوں میں کیا جاتا ہے جو آج مذہب کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے گھر پر کبھی بغیر نہائے اور پُوجا کئے منہ میں پانی کی ایک بوند تک بھی ڈالی ہو مجھے ایک بار بخار کی حالت میں بغیر نہائے ہوئے مجبوراً دوا پینا پڑی تھی۔ اس کا مجھے مہینوں رنج رہا۔ ہمارے گھر میں دھوبی قدم نہیں رکھنے پاتا تھا چمار یا تو دالان میں بھی نہ بیٹھ سکتی تھیں اور جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتے ہوئے مجھے سخت نفرت معلوم ہوتی تھی لیکن یہاں آ کر گویا میں ایک ظلمت کدہ میں پہنچ گئی۔ میرے شوہر بڑے رحیم۔ خوش اخلاق، قابل شخص ہیں۔ ان کے یہ اوصاف دیکھ کر میرے باپ ان پر مجھ ہوئے لیکن افسوس! وہ کیا جانتے تھے۔ کہ یہ لوگ ایسے لامذہب ہیں۔ سندھیا

اور عبادت تو درکنار، کوئی یہاں روزانہ نہانا بھی نہیں ہمیشہ کمرے میں مسلمان عیسائی آیا
کرتے ہیں اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی، چا، دودھ پی لیتے ہیں اور صرف اسی قدر نہیں
بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے مٹھائیاں بھی کھا لیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے انہیں
لیمنڈ پیتے دیکھا تھا۔ سا ئیس جو چمار ہے۔ بغیر روک ٹوک گھر میں آتا ہے اور یورے سے
پینے نکال لے جاتا ہے۔ سنتی ہوں۔ وہ اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے
بھی جایا کرتے ہیں۔ یہ بے عنوانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں میری طبیعت متنفر ہوتی
جاتی ہے۔ جب وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آجاتے ہیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر قریب
بٹھا لیتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اپنی
اس ذلت پر اپنے نامعقول طرز زندگی پر میرے چشم دل سے لہو کے آنسو بہنے لگتے
ہیں۔ اُف! ہندو قوم! تو نے ہم عورتوں کو ایسا کمزور بنا دیا۔ کیا اپنے خاوندوں کی لونڈی
بننا ہی ہماری زندگی کا فرض اولے ہے۔ کیا ہمارے خیال۔ ہمارے ارادے اور ہمارے
فرائض کی کچھ قیمت نہیں ہے۔

اب مجھے صبر نہیں آتا۔ آج میں ان حالات کا فیصلہ کر دینا چاہتی ہوں۔ میں
اس دام بلا سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ شرمناک زندگی اب مجھ سے ایک ساعت بھی
نہیں برداشت ہوسکتی۔ میں نے اپنے والدین کے دامن میں پناہ لینے کا ارادہ کر لیا ہے
آج یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ میرے شوہر اس میں صرف شامل ہی نہیں ہیں بلکہ اس کے خاص
محرکوں میں ہیں۔ انہیں کی کوشش اور ایما سے اس نامہذبانہ بدعت کا ظہور ہوا ہے
مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں سنتی ہوں مسلمان بھی اس

قطار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ کیا بھگوان مذہب کی حفاظت کیلئے
اب اوتار نہ لینگے؟ کیا اس سے بھی زیادہ کسی مذہبی کجروی کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔
برہمن ذات اپنے خاص بھائیوں کے علاوہ دوسرے برہمن تک کا چھُوا ہُوا کھانا
گوارا نہیں کرتی۔ وہی ذی وقعت قوم آج اس پستی کو پہنچ گئی ہے کہ کالیتھوں۔ بنیوں۔
مسلمانوں کے ساتھ تک بیٹھ کر کھانے میں دریغ نہیں کرتی بلکہ اُسے قومی عروج
قومی اتحاد کا باعث سمجھتی ہے!

شوہر

وہ کونسا مبارک وقت ہوگا۔ جبکہ اُس ملک کی عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونگی
قومی شیرازہ بندی میں مردوں کا ساتھ دیں گی؟ یہ مذہبی تنگ خیالیاں کب مٹیں گی؟
ہم کب تک برہمن، غیر برہمن کی قید میں پھنسے رہینگے! ہمارے شادی بیاہ کے طریقے کب
تک خاندانی قید کی رسی سے بندھے رہینگے۔ ہم کو کب معلوم ہوگا کہ عورت اور مرد کے
خیالات کی موافقت نسبی پابندیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برندا میری
زوجہ نہ ہوتی۔ اور نہ میں اُس کا شوہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں زمین اور آسمان کا
فرق ہے۔ اگرچہ وہ ظاہرا نہیں کہتی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے ان آزادانہ خیالات کو
نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھُونا بھی نہیں چاہتی
اُس کا قصور نہیں، یہ ماں باپ کا قصور ہے۔ جنہوں نے ہم دونوں پر ایسا ظلم کیا تاہم مجھے
خوشی ہے کہ برندا اتنی خوددار ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مشکلات میں بھی اپنے
خیالات پر خواہ وہ صحیح ہوں یا غیر صحیح نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔

کل برندا کھل پڑی میرے کئی دوستوں نے عام دعوت کی تجویز کی تھی میں نے
بخوشی اس کی تائید کی تھی کئی دن کی بحث و تکرار کے بعد آخر کل میرے گنے گنائے
دوستوں نے دعوت کا سامان کر ہی ڈالا۔ ماسوا میرے صرف چار برہمن تھے۔ باقی
لیقال۔ کانستھ اور چند اور مذاہب کے لوگ تھے۔ یہ آزاد روی برندا کے لئے ناقابل
برداشت تھی۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا۔ تو وہ ایسی بیچین تھی۔ گویا اس کے دل پر
کوئی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میری طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی :۔
"اب تو بہشت کا دروازہ ضرور کھل گیا ہوگا"
یہ نا ملائم الفاظ میرے دل پر تیر کی طرح لگے۔ کرخت آواز سے بولا۔ بہشت
اور دوزخ کے خیال میں وہ رہتے ہیں۔ جو کاہل ہیں۔ مردہ ہیں۔ ہماری دوزخ اور بہشت
سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دارعمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں"
برندا۔ آفرین ہے آپ کی ہمت اور مردانگی کو اب دنیا میں آرام وچین کا راج ہو
جائیگا۔ دنیا کو آپ نے بچا لیا۔ اس سے بڑھکر اسکی اور کیا بھلائی ہوسکتی ہے"؟
میں نے جھلا کر کہا۔ "جب ایشور نے تمہیں ان باتوں کے سمجھنے کی قوت ہی نہیں
دی تو میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ اس باہمی تفرق اور تمیز سے ہمارے ملک کو جو نقصان
پہنچ رہا ہے اُسے موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس تفرقہ کے مٹنے سے
قوم کو جو نفع ہوگا۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ البتہ جو لوگ جان کر بھی انجان بنیں ان کی
دوسری بات ہے۔
برندا۔ کیا بغیر ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہوئے آپس میں محبت نہیں پیدا ہو
سکتی؟ میں نے اس بحث میں پڑنا فضول تصور کر کے کسی ایسے اصول کی آڑ لینا

مناسب خیال کیا جس میں مباحثہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ برندا مذہبی عقائد پر جان دیتی ہے میں نے اُسی کے منتر سے اُسے تسخیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگ مذہبی عقاید کا بھی احترام نہیں کرتے۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ذرا غور تو کرو۔ یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ ہم سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہوتے ہوئے۔ ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اعلیٰ اور ادنےٰ کی تخصیص کریں۔ یہ ساری دنیا۔ اُسی معبود کا حقیقی جلوہ ہے۔ ہر ایک ذی روح اُسی نورِ حقیقی سے منوّر ہے۔ صرف اسی نفسانیت کے پردہ نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی خودپروری نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے۔ ورنہ دراصل ہم سب ایک ہیں جس طرح سورج کی روشنی مختلف مکانوں میں جا کر اخلاقی صورت اختیار نہیں کرتی۔ اسی طرح پروردگار عالم کی روشنی بھی مختلف اجسام میں جاگزیں ہو کر علیحدہ نہیں ہو جاتی کیا سورج کی روشنی جھونپڑیوں پر نہیں پڑتی۔ میں تو کہوں گا کہ جھونپڑیوں پر محلوں سے کہیں زیادہ پڑتی ہے۔ علےٰ ہذا۔ میرے اس عارفانہ سیلاب نے برندا کے سوکھے ہوئے دل کو شاداب کر دیا ہمہ تن گوش ہو کر میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہو گیا۔ تو اس نے میری طرف ارادتمندانہ نگاہوں سے دیکھا اور رونے لگی۔

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے مگر اُسے گرم کر کے ہم اُس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ برندا کے دل سے خاندانی عظمت اور قومی غرور کے حروف مٹ گئے ان کی جگہ عالمگیر روحانی ارتباط کے حروف منقوش ہو گئے۔

بیوی

سوامی جی کے گیان اُپدیش نے مجھے بیدار کر دیا۔ اُف! میں اندھے کنوئیں میں پڑی تھی۔ اُس نے اُٹھا کر مجھے ایک روشن قلعہ کوہ پر پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اعلےٰ خاندان کے غرور میں اپنی اونچی ذات کے ناجائز فخر میں کتنے ہی نفوس کی بے عزتی کی۔ اے پرماتما تو مجھے معاف کر، میں نا اہل تھی۔ ناسمجھ تھی۔ مجھ غریب کی اس دعا کو قبول کر۔ اس خیال کے باعث میرے دل میں اپنے قابل احترام شوہر سے جو کدورت پیدا ہو گئی تھی اور جو محبت کی کمی میری طرف سے ظاہر ہوئی۔ اُسے معاف فرما۔

جب سے میں نے وہ نورانی الفاظ سنے ہیں میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے طرح طرح کے نیک ارادے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

کل دھوبن کپڑے لے کر آئی تھی۔ اُس کے سر میں بُرا درد تھا۔ کراہ رہی تھی۔ پہلے میں اُسے اس حالت میں دیکھ کر شاید زبانی ہمدردی کرتی یا مہری سے تھوڑا سا تیل دلا دیتی۔ پر کل میرا دل بے چین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا وہ میری بہن ہے میں نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اور کامل ایک گھنٹہ تک اُس کے سر پر تیل ملتی رہی میں نہیں کہہ سکتی کہ اسوقت مجھے کتنا روحانی لطف آرہا تھا۔ میرا دل خود بخود کسی زبردست کشش کے تابع ہو کر اس کی طرف کھینچا جاتا تھا۔ میری نند نے آکر میرے اس فعل پر کسی قدر ناک بھوں چڑھائی تیور بدلے۔ مگر میں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ آج علے الصبح سخت سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں گلے جاتے تھے مہری کام کرنے اٹھی تو تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں لحاف اوڑھے انگیٹھی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس پر بھی منہ کھولنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ مہری کو دیکھ

کہ میرا دل بھر آیا مجھے اپنی خود غرضی پر شرم آئی میں نے خیال کیا جو یہ ہے۔ وہی میں ہوں اس کی روح میں بھی وہی روشنی ہے لیکن میں آرام سے آگ کے پاس بیٹھی ہوں۔ اور یہ میری خدمت میں مصروف، یہ ناانصافی کیوں؟ کیا اس وجہ سے کہ میں ایک دولت مند شخص کی بیوی ہوں کیا اس وجہ سے کہ خودی نے ہماری نگاہوں پر پردے ڈال دیئے ہیں مجھے کچھ سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فوراً اٹھی اور اپنا شال لاکر مہری کو اڑھا دیا۔ اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا۔ اس نے متعجب ہو کر کہا۔ بہو جی! چھوڑیئے میں کام کر دوں۔ سرکار کو کچہری جانے میں دیر ہو جائے گی۔"

میں نے اپنا لحاف اُتار دیا اور اُس کے ساتھ بیٹھ کر برتن دھونے لگی۔ غریب عورت مجھے بار بار ہٹانا چاہتی تھی۔ میری نند نے آکر مجھے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا اور اس طرح منہ بنا کر چلی گئی۔ گویا میں کوئی سوانگ بھر رہی ہوں تمام گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ گویا کوئی تعجب خیز واقعہ ہو گیا ہے ہم کتنے خود پرست ہیں ہم پرماتما کی توہین کرتے ہیں۔ نفسانیت کے دام میں پھنس کر اپنے ہی اوپر انواع و اقسام کے ظلم کرتے ہیں! افسوس!

شوہر

شاید میانہ روی عورتوں کی سرشت میں داخل ہی نہیں وہ حدود ہی پر رہ سکتی ہیں برملا کہاں تو ابھی اپنی عالی نسبی پر جان دیتی تھی، قومی وقار کا راگ الاپتی تھی کہاں اب مساوات اور ہمہ اوست کی مورت بنی بیٹھی ہے میری ذراسی تعلیم کا یہ اثر ہے۔ اب میں بھی اپنی قوتِ تالیف پہ ناز کرونگا۔ واقعی یہ جنس تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اسمیں مجھے اعتراض نہیں ہے کہ وہ نیچی ذاتوں کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے، ہنسے، بولے

انہیں پڑھ کر کچھ سناتے لیکن ان کے پیچھے اپنے آپ کو بالکل کھو دینا میں کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

تین دن ہوتے میرے پاس ایک چمار اپنے زمیندار کے مظالم کا رونا رونے آیا۔ بیشک زمیندار نے اس کے ساتھ سختی برتی تھی لیکن وکیل مفت میں تو مقدمہ نہیں کیا کرتا اور پھر ایک چمار کے پیچھے ایک بڑے زمیندار سے دشمنی کروں۔ ایسا کروں تو پھر وکالت کر چکا۔ اس کی فریاد کی آواز برندا کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ میرے در پے ہوئی کہ اس مقدمہ کی پیروی ضرور کیجئے اور لگی بحث مباحثہ کرنے۔ میں نے حیلہ وحوالہ کر کے اسے کسی طرح ٹالنا چاہا لیکن اس نے مجھ سے وکالت نامہ پر دستخط ہوا ہی لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تین دنوں میں میرے پاس کتنے مقدمے ایسے ہی مفت خوروں کے آئے اور مجھے کئی بار برندا کو سخت الفاظ میں فہمائش کرنی پڑی۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے عورتوں کو مذہبی مسائل کی تلقین کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہر ایک اصول کی عملی شان کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ خدا عادل ہے۔ پر اس کی عدالت کے پیچھے اپنے ماحول کو کوئی نہیں بھولتا اگر وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر عمل کیا جاتے تو تمام دنیا میں آج امن و عافیت کی دہائی پھر جاتے لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کا ایک اصول ہی رہیگا۔ اور انسانی اخوت ہمارے نظام معاشری کی ایک محال تمنا۔

ہم ان دونوں مسائل کی زبان سے تعریف کرتے ہیں۔ ان پر مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتے ہیں عوام کی نظروں میں وقار حاصل کرنے کے لئے ان سے مدد لیتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا ناممکن ہے مجھے نہیں معلوم تھا کہ برندا اتنی ذرا سی معمولی اور موٹی بات بھی نہیں سمجھتی۔

برندا کا انہماک روزانہ ناقابلِ برداشت ہوتا جاتا ہے آج سب کے کھانے کیلئے ایک ہی قسم کا کھانا بنا ہے۔ اب تک گھر کے خاص آدمیوں کیلئے باریک چاول پکتے تھے۔ ترکاریاں گھی میں بنائی جاتی تھیں۔ دودھ مکھن اور میوہ جات وغیرہ منگائے جاتے تھے۔ نوکروں کے موٹا چاول تیل کی ترکاری۔ مٹر کی دال رہتی تھی۔ دودھ وغیرہ اُنہیں نہیں دیئے جاتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں بھی یہی دستور زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے۔ اور نہ نوکروں نے اس کے متعلق کبھی شکایت کی لیکن آج دیکھتا ہوں تو برندا نے سب کے لئے ایک ہی قسم کا کھانا بنوایا ہے آج ملازموں نے بھی وہی کھانے کھاتے ہیں جو گھر کے لوگوں نے کھاتے۔ میں کچھ بول نہ سکا۔ متحیر سا ہوگیا۔ برندا خیال کرتی ہے۔ کہ کھانے میں فرق کرنا نوکروں پر ظلم ہے۔ کیسا بچوں کا سا خیال ہے! یہ اپنے مساوات کی دھن میں شریف رذیل چھوٹے بڑے کا فرق مٹانا چاہتی ہے۔ اے بیوقوف! یہ تفریق ہمیشہ قائم رہی ہے اور رہے گی۔ میں بھی ملکی اتحاد کا حامی ہوں اور تمام تعلیم یافتہ ابنائے وطن اس اتحاد پر جان دیتے ہیں لیکن کوئی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا۔ کہ ان مزدوروں۔ خدمتگاروں کو برابری کا حق دیا جاتے۔ ہم اُن میں تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں ان کو حالتِ افلاس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ ہوا تمام دُنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ پر اس کی اصلیت کیا ہے۔ یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں۔ خواہ اس کا اظہار نہ کیا جاوے۔ اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ ہمارا ملکی وقار قائم ہو۔ ہمارا دائرہ اثر وسیع ہو۔ ہم اپنے حقوق کے لئے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کرسکیں۔ ہمیں یہ کہنے کا موقع مل جاتے کہ ہماری آواز صرف تعلیم یافتوں کی آواز نہیں ہے

بلکہ تمام قوم کی متحدہ آواز ہے لیکن بر ندا اتنا بھی نہیں کھینی۔

بیوی

کل میرے شوہر کا منشا ظاہر ہوا۔ اس وقت میری طبیعت سخت محزون ہے اے خدا۔ دنیا میں اتنی نمائش ہے۔ لوگ اتنے خود غرض ہیں! اتنے ظالم ہیں۔ مجھے کل یہ دردناک تجربہ ہوا میں اس نصیحت کو سُن کر اپنے شوہر کو دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا فخر تھا کہ اپنے نفسِ مطمئنہ کی خدمت گذاری کا موقع حاصل ہے یہ میرے مقدر کی خوبی ہے لیکن یہ مجھے آج معلوم ہوا کہ جو لوگ ایک ساتھ دو ناؤں پر بیٹھنے کے مشتاق ہیں زیادہ تر وہی قومی خیر اندیش کہلاتے ہیں۔

کل میری نند کی رخصتی تھی وہ سسرال جا رہی تھی شہر کی بہتیری عورتیں آئی تھیں وہ سب عمدہ لباس اور مرصع زیورات سے آراستہ ہو کر قالینوں پر بیٹھی ہوئی تھیں میں ان کی مہمانداری میں مصروف تھی۔ کہ یکایک مجھے دروازے پر چند عورتیں اُس جگہ زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں جہاں اُن عورتوں کی سلیپریں اور جوتیاں رکھی تھیں۔ یہ بیچاریاں بھی رخصتی دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے ان کا وہاں بیٹھانا نامناسب معلوم ہوا اس لئے میں نے ان کو بھی لاکر قالین پر بٹھلا دیا۔ اس پر اُن خاتونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور تھوڑے عرصے میں سب کی سب کسی نہ کسی حیلہ سے ایک ایک کر کے چلی گئیں اتنے میں کسی نے میرے شوہر تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ باہر سے نہایت مغلوب الغضب ہو کر آئے اور بھری سبھا میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

آج علے الصبح اٹھی۔ تو میں نے عجیب واقعہ دیکھا شب میں مہمانوں کی دعوت و

مدارات کے بعد جو جُوٹھے تپل۔ شکورے۔ دونے وغیرہ باہر میدان میں پھینک دیئے گئے تھے۔ اس وقت پچاسوں آدمی انہیں تپلوں پر گرے ہوئے ان کو چاٹ رہے تھے! ہاں انسان تھے اور انسان وہی انسان جن پر پرماتما کا جلوہ ہے۔ روشنی ہے بہتیرے کُتّے بھی ان تپلوں پر جھپٹ رہے تھے۔ پر یہ کنگلے کُتّوں کو مار کر ہٹا دیتے تھے۔ ان کی حالت کُتّوں سے بھی گئی گذری تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے میری آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ ایشور! یہ بھی ہمارے بھائی بہن ہیں ہماری ہی روحیں ہیں۔ ان کی ایسی قابلِ رحم حالت! میں نے اُسی وقت مہری کو بھیج کر اُن آدمیوں کو بُلایا۔ اور میوے مٹھائیاں وغیرہ جو مہمانوں کے لئے رکھی ہوئی تھیں سب کی سب تپلوں میں رکھ کر انہیں دے دیں۔ مہری تھرّانے لگی کہ مالک سُنیں گے تو میرے سر کا ایک بال نہ چھوڑیں گے لیکن میں نے اُسے ڈھارس دی۔ تب اُس کی جان میں جان آئی۔

ابھی یہ بیچارے مٹھائیاں کھا ہی رہے تھے کہ میرے شوہر صاحب بھی غصّے میں بھرے ہوئے آئے اور نہایت سخت آواز میں بولے "تمہاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گیا ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک آفت مچاتے رہتی ہو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ مٹھائیاں ڈوسٹرِل کیلئے نہیں بنوائی گئی تھیں جیمانوں کے لئے بنوائی گئی تھیں اب مہمانوں کو کیا دیا جائیگا۔ کیا تم نے میری عزّت کو خاک میں ملانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے"

میں نے مستقل مزاجی سے کہا "آپ فضول غصّہ کرتے ہیں۔ آپ کی جس قدر مٹھائیاں میں نے خرچ کی ہیں۔ وہ سب منگا دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ کہ کوئی شخص تو مٹھائیاں کھاتے اور کوئی تپل اور دونے چاٹے۔ ڈومڑے بھی تو انسان

ہیں۔ اُن کی بھی تو روح وہی ہے۔ کیا یہ نا انصافی نہیں ہے۔

شوہر صاحب بولے رہنے بھی دو۔ بے وقت کی شہنائی بجاتی ہو۔ جب دیکھو وہی مرغ کی ایک ٹانگ۔ کہ سب روحیں ایک سی ہیں۔ اگر ایک سی ہیں تو ایشور کو کس نے منع کر دیا تھا کہ سب کو ایک حالت میں نہ رکھے۔ اس اعلےٰ اور ادنےٰ کی تفریق اُس نے کیوں رکھی ہے۔ بے سر پیر کی بحث کرتی ہو۔"

میں خاموش ہو گئی۔ بول نہ سکی۔ میرے دل سے شوہر کی عزت اور محبت اُٹھنے لگی۔ افسوس ہے۔ نفسانیت نے ہم کو کس قدر خود غرض بنا دیا ہے۔ ہم ایشور کا بھی سوانگ بھرتے ہیں! کتنی شرمناک ریاکاری ہے ہم حقیقت کو ملکی مفاد اور ذاتی اغراض پر قربان کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کوشش بارور نہیں ہوتی تو تعجب کیا ہے۔

موٹھ

ڈاکٹر جے پال نے اعلیٰ درجے کی سند حاصل کی تھی لیکن اسے تقدیر کہئے یا کاروباری اصولوں سے لاعلمی کہ انہیں اپنے پیشہ میں کبھی فروغ نہ ہؤا ان کا دکان ایک تنگ گلی میں واقع تھا لیکن انہیں کبھی کشادہ مکان لینے کا کبھی خیال نہ ہؤا۔ دواخانہ کی الماریاں۔ شیشیاں اور دوسرے جتنی آلات بھی صاف ستھرے نہ تھے۔ اس کفایت شعاری کے اصول کو وہ اپنی خانہ داری میں سختی سے ملحوظ رکھتے تھے۔ لڑکا جوان ہو گیا تھا لیکن ابھی تک اس کی تعلیم کی فکر نہ تھی۔ سوچتے تھے اتنے دنوں کتابوں سے سر مار کر ایسی کونسی شہرت پیدا کر لی۔ کہ خواہ مخواہ اس کی تعلیم پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دوں انکی بیوی صابر اور جفاکش عورت تھی لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان اوصاف پر اتنا بوجھ رکھ دیا تھا کہ ان کی کمر بھی خم ہو گئی تھی۔ ماں بھی زندہ تھیں لیکن زندگی سے بیزار۔ جو گنگا اشنان کے لئے ترس ترس کے رہ جاتی تھیں دوسرے متبرک مقاموں کی جاترا کا ذکر ہی کیا۔ ان بیدردانہ کفایت شعاریوں کا نتیجہ یہ تھا۔ کہ اس گھر میں اطمینان اور مسرت کا نام نہ تھا۔ اگر کوئی مدِ فاضل تھی تو وہ بڑھیا مہری جگیا تھی اس نے ڈاکٹر صاحب کو گود میں کھلایا تھا اور اسے اس گھر میں کچھ ایسی محبت ہو گئی۔ کہ سب طرح کی سختیاں جھیلتی تھی پر ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

۲

ڈاکٹر صاحب طبّی آمدنی کی کمی کو کپڑے اور شکر کے کارخانوں میں حصّہ لیکر پورا کرتے تھے آج سوءِ اتفاق سے ببئی کے ایک کارخانے نے ان کے پاس سالانہ نفع کے ۵۰۰، روپے بھیجے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیمہ کھولا۔ نوٹ گنے اور ڈاکیہ کو رخصت کرنا چاہتے تھے لیکن ڈاکئے کے پاس روپے زیادہ تھے۔ بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ بولا حضور روپے لے لیں اور مجھے نوٹ دے دیں تو بڑا احسان ہو۔ بوجھ ہلکا ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکیوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں مفت دوائیں دے دیا کرتے تھے سوچے آخر مجھے بنک جانے کیلئے تانگہ منگانا ہی پڑیگا۔ کیوں نہ مفت کرم داشتن کے اصول پر عمل کروں۔ روپے گن کر ایک تھیلی میں رکھ دیئے اور سوچ ہی رہے تھے۔ کہ چلوں انہیں بنک میں رکھتا آؤں۔ کہ ایک مریض نے بلا بھیجا۔ ایسے موقعے یہاں شاذ ہی آتے تھے اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو صندوقچہ پر بھروسہ نہ تھا لیکن مجبوراً تھیلی کو صندوقچہ میں رکھا۔ اور مریض کو دیکھنے چلے گئے وہاں سے لوٹے تو تین بج چکے تھے۔ بنک بند ہو چکا تھا آج روپے کسی طرح جمع نہ ہو سکتے تھے حسب معمول شفا خانہ میں بیٹھ گئے۔ آٹھ بجے رات کو جب اندر جانے لگے تو احتیاطاً تھیلی کو اندر رکھنے کے لئے صندوق سے نکالا تھیلی کچھ ہلکی معلوم ہوتی اُسے فوراً دواؤں کے ترازو پر تولا۔ ہوش اُڑ گئے پورے ڈھائی سو روپے کم تھے۔ اعتبار نہ ہُوا۔ تھیلی کھول کر روپے گنے۔ ڈھائی سو روپے کم نکلے مجنونانہ بے صبری کے ساتھ صندوق کے دوسرے خانوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ لیکن بے سود! روپے غائب ہو گئے تھے۔ مایوس ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور حافظہ کو مجتمع کرنے کے لئے آنکھیں بند کر کے سوچنے لگے۔ میں نے روپے کہیں

الگ تو نہیں رکھ دیئے۔ ڈاکیہ نے روپے کم تو نہیں دیئے۔ میں نے شمار کرنے میں تو غلطی نہیں کی۔ ہرگز نہیں میں نے پچیس پچیس روپے کی گڈیاں لگائی تھیں۔ پوری تیس گڈیاں تھیں خوب یاد ہے۔ میں نے ایک ایک گڈی گن کر تھیلی میں رکھی حافظہ مطلق خطا نہیں کرتا۔ صندوق کی کنجی بھی بند کر دی تھی۔ مگر اوہو! اب سمجھ میں آگیا۔ کنجی میز پر چھوڑ دی۔ عجب نہیں اُسے جیب میں رکھنا بھول گیا۔ وہ ابھی تک میز پر پڑی ہے۔ بس یہی بات ہے کنجی جیب میں ڈالنے کا خیال نہ رہا۔ لیکن لے کون گیا باہر کے دروازے بند تھے۔ گھر میں کوئی میرے روپے پیسے کو چھوتا نہیں۔ آج تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ضرور کسی باہر کے آدمی کی حرکت ہے۔ ممکن ہے کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہو یا کوئی شخص دوا لینے آیا ہو میز پر کنجی پڑی دیکھی ہو اور صندوق کھول کر روپے نکال لئے ہوں۔ اسی سے میں روپے نہیں لیا کرتا۔ کیا عجب ہے ڈاکیہ ہی کی شرارت ہو۔ بہت ممکن ہے اس نے مجھے صندوق میں تھیلی رکھتے دیکھا تھا۔ یہ روپے جمع ہو جاتے تو میرے پاس پورے ..... ہزار روپے ہو جاتے۔ سود کا حساب لگانے میں آسانی ہوتی۔ کیا کروں؟ پولیس میں اطلاع کردوں؟ بالکل بے سُود۔ خواہ مخواہ کا دردِ سر ہے۔ محلہ بھر کے آدمیوں کا دروازہ پر مجمع ہوگا۔ دس پانچ آدمیوں کو گالیاں کھانی پڑیں گی اور حاصل کچھ نہیں تو کیا صبر کر کے بیٹھ رہوں کیسے صبر کر دوں۔ یہ کوئی مالِ مفت کا نہ تھا۔ حرام کی رقم ہوتی۔ تو سمجھتا مالِ حرام بود بجائے حرام رفت یہاں تو ایک ایک پیسہ اپنے پسینے کا ہے میں جو اتنی کفایت سے بسر کرتا ہوں، اتنی تکلیفیں اٹھاتا ہوں بخیل مشہور ہوں۔ گھر کے ضروری مصارف میں بھی قطع و برید کرتا رہتا ہوں۔ کیا اسی لئے کہ کسی اُچکے کے لئے سامانِ تفریح

مہیا کروں؟ مجھے ریشم سے بھی نفرت نہیں، نہ میوے کم مرغوب ہیں۔ نہ سوءِ ہضم کی شکایت ہے کہ بالائی ہضم نہ کر سکوں۔ نہ ضعفِ بصر ہے کہ تھیئٹر یا سائینما کا لطف نہ اٹھا سکوں۔ آخر یہ نفس کشی اسی لئے تو کرتا ہوں کہ میرے پاس چار پیسے ہو جائیں ضرورت کے وقت کسی کا دستِ نگر نہ ہوں کچھ جائداد دے سکوں اور نہیں تو اچھا گھر ہی بنا لوں اور اس نفس کشی کا یہ نتیجہ! گاڑھی محنت کے روپے لیں گا و خورد ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہو جاتا کہ یہ کس ظالم کی حرکت ہے۔ ستم ہے کہ میں یوں دن دھاڑے لُٹ جاؤں اور اس غارت گر کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ اس کے گھر عید ہو رہی ہو گی جشن منایا جا رہا ہو گا۔ سب کے سب بغلیں بجا رہے ہونگے۔

اس خیال سے ڈاکٹر صاحب پر ایک پُر اضطراب جذبۂ انتقام کا غلبہ ہوا۔ میں نے کبھی کسی فقیر کو۔ سادھو کو دروازے پر کھڑا ہونے نہیں دیا۔ باوجود تقاضوں کے احباب کی کبھی دعوت نہیں کی۔ عزیزوں اور مہمانوں سے ہمیشہ محترز رہا۔ کیا اسی لئے کہ یوں ایک شاطر حریف کا تختۂ مشق بنوں۔ کاش مجھے اس کا سراغ مل جاتا تو میں ایک زہریلی سوئی سے اس کا کام تمام کر دیتا۔

مگر کوئی علاج نہیں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش کا معاملہ ہے خفیہ پولیس والے بھی بس نام ہی کے ہیں، سراغ رسانی کا مادہ نہیں۔ ان کی ساری کارروائی سیاسی تقریروں کی غلط رپوریں لکھنے پر ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کتنا معذور ہے کسی مسمرائزر کے پاس چلوں۔ وہ اس عقدہ کو حل کر سکتا ہے۔ سنتا ہوں یورپ اور امریکہ میں اکثر چوریوں کا سراغ اس ترکیب سے مل جاتا ہے۔ مگر یہاں ایسا با کمال کون ہے۔ اور پھر مسمریزم کے جوابات ہمیشہ معتبر نہیں ہوتے جوتشیوں

کیطرح وہ بھی قیاسات کے تجربے کنارہیں غوطے کھانے لگتے ہیں کچھ لوگ نام بھی تو
نکالتے ہیں۔ ان کے بڑے حیرت انگیز معجزے سنتے ہیں میں نے کبھی ان روایتوں پر
اعتبار نہیں کیا۔ مگر کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ ورنہ اس مادی دور میں اس علم کا وجود
ہی نہ رہتا۔ آجکل کے علما طبیعات کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر بالفرض کسی
ملّا نے کسی بے جرم کا نام تبلا بھی دیا تو میرے ہاتھ میں اُس کے پاداش کا کونسا آلہ
ہے وہ ضمیر گوئی شہادت کا کام نہیں دے سکتی۔ بجز اس کے کہ ایک لمحہ کے لئے
میری طبیعت کو سکون ہو جائے اور اس سے کیا حاصل ہے!

ہاں خوب یاد آیا۔ ندی کی طرف جاتے ہوئے وہ جو ایک اوجھا بیٹھتا ہے۔
اس کے کرتب کے اکثر واقعات سننے میں آتے ہیں۔ سنتا ہوں دفینوں کا پتہ تبلا
دیتا ہے۔ مریضوں کو بات کی بات میں چنگا کر دیتا ہے۔ چوری کے مال کا پتہ لگا دیتا ہے
موٹھ چلاتا ہے۔ موٹھ کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ موٹھ چلا اور چور کے منہ سے خون
جاری ہوا۔ جب تک وہ مال واپس نہ کر دے خون بند نہیں ہوتا۔ یہ ترکیب اگر کارگر ہو
جائے تو میری دلی منشا پوری ہو جائے۔ مُنہ مانگی مراد بر آئے روپے بھی مل جائیں۔ چور
کی تنبیہ بھی ہو جائے۔ اس کے یہاں ہمیشہ غرضمندوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ اگر اس
میں کچھ کرتب نہ ہوتا تو اتنے لوگ کیوں جمع ہوتے۔ اس کے چہرہ سے ایک ہیبت برستی
ہے۔ آجکل کے تعلیم یافتہ لوگوں کو تو ان باتوں پر اعتقاد نہیں ہے لیکن نیچ آدمیوں اور
جہلا میں اس کا کافی چرچا ہے۔ بھوت، آسیب جن کے فسانے روز ہی سُنا کرتا ہوں
کیوں نہ اُسی اوجھے کے پاس چلوں۔ بالفرض کوئی فائدہ نہ بھی ہو تو میرا نقصان ہی
کیا ہے۔ جہاں ڈھائی سو گئے ہیں۔ دو چار روپے کا خون اور سہی۔ مال مل گیا۔ تو

پوچھنا ہی کیا چور کی قرار واقعی سرزنش بھی ہو جاتے گی یہ موقع بھی اچھا۔ آدمیوں کا ہجوم کم ہو گا۔ چلنا چاہتے۔

۳

دل میں یوں فیصلہ کر کے ڈاکٹر صاحب اُس سیانے کے گھر کی طرف چلے جاڑے کی رات تھی۔ نو بج گئے تھے۔ راستہ قریب قریب بند ہو گیا تھا کبھی کبھی گھروں میں اماں تن کی صدا کانوں میں آجاتی تھی۔ کچھ دُور کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا۔ راستہ کے دونوں طرف سبزیوں کے کھیت تھے۔ گیدڑوں کے ہوانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوتا ہے ان کا غول قریب ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اکثر دُور سے ان کا نغمہ مگر وہ سننے کا اتفاق ہوا تھا۔ مگر اس وقت اس سناٹے میں اور اتنے قریب سے ان کی چیخ سُن کر انہیں ڈر لگا۔ کئی بار اپنی چھڑی زمین پر ٹپکی۔ پیر دھم دھماتے۔ یہ جانور بزدل ہوتے ہیں۔ آدمی کے قریب نہیں آتے لیکن پھر اندیشہ ہوا۔ کہیں ان میں کوئی پاگل ہو تو اس کا کاٹا تو بچتا ہی نہیں۔ یہ فکر ہوتے ہی جراثیم اور بیکٹیریا اور پاسٹیور انسٹیٹوٹ اور کسولی کے خیالات ان کے دماغ میں چکر کھانے لگے۔ وہ تیزی سے قدم بڑھاتے چلے آتے تھے۔ دفعتاً خیال آیا۔ کہیں میرے گھر میں کسی نے روپے اڑا دیتے ہوں تو؟ فوراً ٹھٹک گئے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں انہوں نے اس صورت حال کا بھی فیصلہ کر لیا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ گھر والوں کو تو اور بھی سخت سزا ملنی چاہتے۔ چور کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہو سکتی لیکن گھر والوں کی ہمدردی کا میں مستحق ہوں۔ انہیں جاننا چاہتے۔ کہ میں جو کچھ کرتا ہوں انہیں کے لئے کرتا ہوں۔ اگر اس پر بھی وہ مجھے یوں دغا دینے پہ آمادہ ہوں تو ان سے زیادہ کافر نعمت اُن سے زیادہ احسان فراموش۔ ان سے زیادہ بے رحم اور کون ہو گا۔ انہیں اور بھی سخت

سزا ملنی چاہئے۔ ایسی عبرت ناک کہ پھر کبھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔

آخر وہ اودھے کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ آدمیوں کی بھیڑ نہ تھی۔ انہیں تسکین ہوئی ہاں ان کے تیز قدم ذرا دھیمے پڑ گئے اور پھر خیال ہوا کہیں یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہو۔ تو خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے۔ جو سُنے احمق بنائے۔ شاید اودھا بھی مجھے اپنے دل میں حقیر سمجھے لیکن اب تو آ گئے۔ یہ تجربہ بھی حاصل کر لوں۔ اور کچھ نہ ہو گا۔ تو امتحان ہی سہی۔ اودھا کا نام بدھو تھا۔ لقب چودھری۔ ذات کا چمار۔ مکان بہت تنگ اور بوسیدہ۔ سائبان اتنا نیچا کہ جھکنے پر بھی سر میں ٹکر لگنے کا خوف ہوتا تھا۔ دروازہ پر ایک نیم کا درخت تھا۔ اس کے نیچے ایک چبوترہ نیم کے درخت پر دُور سے ایک جھنڈی سی لہراتی ہوئی نظر آتی۔ چبوترہ پر مٹی کے سینکڑوں ہاتھی سیندور سے رنگے ہوئے کھڑے تھے۔ کئی لوہے کے نوکدار ترسول بھی نظر آتے تھے۔ جو گویا ان سُست رفتار ہاتھیوں کے لئے آنکس کا کام دے رہے تھے دس بجے تھے بدھو چودھری جو ایک سیاہ فام قوی ہیکل توندیلا رُعب دار آدمی تھا۔ ایک پھٹے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ بوتل اور گلاس بھی سامنے رکھے ہوئے تھے۔

بدھو نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھ کر فوراً بوتل چھپا دی۔ اور نیچے اُتر کر سلام کیا۔ گھر میں سے ایک بڑھیا نے مونڈھا لا کر ان کے لئے رکھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ جھینپتے ہوئے سارا واقعہ مفصل بیان کیا۔ بدھو نے کہا۔ حضور یہ کون بڑا کام ہے ابھی اسی اتوار کو درگا جی کی گھڑی چوری گئی تھی۔ بہت کچھ تحکیکات کی۔ پتہ نہ چلا۔ مجھے بلایا۔ میں نے بات کی بات میں پتہ لگا دیا۔ پانچ روپے انعام دیئے۔ کل کی بات ہے۔ جمعدار کی گھوڑی کھوئی گئی تھی۔ چاروں طرف دوڑے پھرے۔ میں نے ایسا پتہ بتایا۔

کہ گھوڑی کھڑی چرتی ہوئی ملگئی اس بدیا کی بدولت حضور حاکم حکام سب مانتے ہیں۔

جے لال کو داروغہ اور جمعدار کا ذکر ناگوار گذرا۔ ان جاہلوں کی نگاہوں میں جو کچھ ہیں۔ وہ داروغہ اور جمعدار ہیں۔ بولے۔ میں محض چوری کا پتہ لگانا نہیں چاہتا۔ میں چور کو سزا دینی چاہتا ہوں۔

بدھو نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں بند کیں۔ جماہیاں لیں، چٹکیاں بجائیں اور بولا، یہ گھر کے کسی آدمی کا کام ہے۔

جے لال۔ کچھ پرواہ نہیں۔ کوئی ہو۔

بڑھیا۔ پیچھے سے کوئی بات بنے بگڑے گی۔ تو حضور ہمیں کو برا کہیں گے۔

جے لال۔ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ میرا اپنا لڑکا ہی ہو۔ تو بھی اُسے سبق دینے سے باز نہ آؤں گا۔ بلکہ اگر گھر کے کسی آدمی کی شرارت ہے تو میں اس کے ساتھ اور بھی سختی کرنا چاہتا ہوں۔ باہر کا آدمی میرے ساتھ دغا کرے تو معافی کے قابل ہے لیکن گھر کے آدمی کو میں کسی طرح معاف نہیں کرسکتا۔

بدھو "تو حضور چاہتے کیا ہیں"؟

جے لال۔ بس یہی کہ میرے روپے مل جائیں۔ اور چور کسی سخت عذاب میں گرفتار ہو جائے"

بدھو۔ موٹھ چلادوں"؟

بڑھیا" نہ بیٹا، موٹھ کے پاس نہ جانا۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے"

جے لال" تم موٹھ چلادو۔ اس کا جو کچھ محنتانہ، شکرانہ ہو۔ وہ میں دینے کو تیار ہوں"

بڑھیا" بیٹا میں پھر کہتی ہوں۔ موٹھ کے پھیر میں نہ پڑ۔ کوئی جوکھم کی بات آپڑی

تو یہی بابوجی پھر تیرے سر ہونگے۔ اور تیرے بنائے کچھ نہ بنے گی۔ کیا جانتا نہیں۔ موٹھ کا اُتار کتنا کٹھن ہے۔"

بدھو "ہاں بابوجی۔ سوچ لیجئے۔ موٹھ تو میں چلا دوں گا۔ لیکن اُس کو اُتارنے کا جمہ (ذمہ) نہیں لے سکتا۔"

جے لال "اجی کہہ تو دیا۔ میں تم سے اُتارنے کو نہ کہونگا۔ چلاؤ بھی تو۔"

بدھو نے ضروری سامان کی ایک طویل فہرست پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب نے چیزیں خریدنے کے مقابلہ میں نقد روپیہ دینا زیادہ مناسب سمجھا بدھو بخوشی راضی ہو گیا چلتے وقت بولا۔ "ایسا منتر چلاؤں گا کہ صبح ہوتے ہوتے چور میرے پاس مال لئے ہوئے آکر حاضر ہو جاتے۔"

بدھو نے کہا آپ نسا کھاطر رہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔

۴

جے لال گھر پہنچے تو گیارہ بج گئے تھے۔ جاڑے کی رات۔ کڑاکے کی سردی تھی ان کی ماں اور بیوی دونوں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھیں طبیعت کو بہلانے کے لئے بیچ میں ایک انگیٹھی رکھ لی تھی جس کا اثر جسم کی نسبت خیال پر زیادہ پڑتا تھا۔ یہاں کوئلہ "تکلف" سمجھا جاتا تھا۔ بڑھیا مہری جگیا جو مادی حرارت سے اس قدر بے نیاز تھی۔ وہیں ایک پھٹا ٹاٹ کا ٹکڑا اوڑھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ بار بار اُٹھ کر اندھیری کوٹھری میں جاتی۔ طاق پر کچھ ٹٹول کر دیکھتی اور پھر اپنی جگہ پر آکر پڑ رہتی۔ بار بار پوچھتی کتنی رات گئی ہوگی۔ ذرا بھی کھٹکا ہوتا۔ تو چونک پڑتی اور متردد نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی آج ڈاکٹر صاحب نے خلاف معمول کیوں اتنی دیر لگائی۔ اس کا سب کو تعجب

تھا۔ ایسا بہت کم موقع ہوتا تھا۔ کہ انہیں مریضوں کو دیکھنے کیلئے رات کو جانا پڑتا ہو اگر کچھ لوگ انکے دستِ شفا کے قایل بھی تھے تو رات کو اس گلی میں آنیکی زحمت نہ گوارا کرتے تھے ملکی یا مجلسی معاملات سے ان کو اتنا شوق نہ تھا۔ جو اس تاخیر کا باعث ہو مجلس احباب میں وہ کبھی شریک نہ ہوتے تھے کسی تھئیٹر میں جانا ان کے دائرہ خیال سے بھی باہر تھا۔ ماں نے کہا۔ جانے کہاں چلے گئے۔ کھانا بالکل پانی ہو گیا ہو گا۔

اہلیہ "آدمی جاتا ہے تو کہہ کے جاتا ہے۔ آدھی رات سے اوپر ہو گئی"۔

ماں "کوئی ایسی ہی اٹک ہو گئی۔ نہیں تو وہ کب گھر سے باہر نکلتے ہیں"۔

اہلیہ۔ "میں تو اب سونے جاتی ہوں۔ ان کا جب جی چاہے آئیں۔ کوئی ساری رات بیٹھا ہوا پہرہ دیگا؟

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ اہلیہ سنبھل بیٹھی۔ ہیگیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ان کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے تاکنے لگی۔ ماں نے پوچھا "آج کہاں اتنی دیر لگا دی؟

جے لال۔ "تم لوگ آرام سے بیٹھی ہو نہ۔ مجھے دیر ہو گئی اس کی تمہیں کیا فکر۔ جاؤ آرام سے سو رہو۔ ان ظاہرداریوں سے میں دھوکے میں نہیں آتا۔ موقع پاؤ۔ تو گلا کاٹ لو۔ اس پر چلی ہو باتیں بنانے"۔

ماں نے شرمندہ اور خفیف ہو کر کہا "بیٹا۔ ایسی دل دکھانے والی باتیں کیوں کرتے ہو۔ گھر میں تمہارا کون بیری ہے جو تمہارا بُرا چیتے گا"

جے لال میں کسی کو اپنا دوست نہیں سمجھتا۔ سبھی میرے دشمن ہیں میری جان کے گاہک نہیں تو کیا۔ آنکھ اوجھل ہوتے ہی میز پر سے ڈھائی سو روپے غائب ہو جاتے

دروازے باہر سے بند تھے کوئی غیر آیا نہیں اور روپے رکھتے ہی رکھتے اُڑ گئے۔ جو لوگ اسطرح میرا گلا کاٹنے پر آمادہ ہوں۔ انہیں کیونکر اپنا سمجھوں۔ میں نے خوب پتہ لگا لیا ہے۔ ابھی ایک سیانے کے پاس سے چلا آرہا ہوں۔ اُس نے صاف کہدیا کہ گھر ہی کے کسی آدمی کا فعل ہے۔ خیر جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ میں بھی ثابت کر دونگا۔ کہ میں اپنے دشمنوں کا دوست نہیں ہوں۔ اگر باہر کے کسی آدمی نے مجھے زک دیا ہوتا تو شاید میں درگذر کرتا۔ لیکن جب گھر کے آدمی جن کے لئے میں رات دن چکی پیستا ہوں میرے ساتھ ایسی دغا کریں۔ تو وہ اسی لائق ہیں کہ ان کے ساتھ ذرا بھی رُو رعایت نہ کیجائے دیکھنا صبح تک چور کی کیا حالت ہوتی ہے۔ میں نے سیانے کو موٹھ چلانے کو کہہ دیا ہے۔ موٹھ چلا اور اُدھر چور کے جان کی خیریت نہیں۔

جگیا گھبرا کر بولی۔ "بھیّا، موٹھ میں تو جان جوکھم ہے۔

جے لال۔ "چور کی یہی سزا ہے"

بڑھیا۔ "کس سیانے نے چلایا ہے؟"

جے لال۔ "بدھو چودھری نے"۔

بڑھیا۔ "ارے رام۔ اُس کے موٹھ کا تو اُتار ہی نہیں۔

جے لال اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو ماں نے کہا۔ سوم کا دھن شیطان کھاتا ہے ڈھائی سو روپے کوئی منہ مار کر لے گیا۔ اتنے میں تو میرے ساتوں دھام ہو جاتے۔

اہلیہ بولی۔ کنگن کیلئے برسوں سے جھینک رہی ہوں۔ اچھا ہوا میری آہ پڑی ہے ماں "۔ بھلا گھر میں ان کے روپے کون چھوتے گا"

اہلیہ "کواڑ کھلے ہونگے۔ کوئی باہر کا آدمی اڑا لے گیا ہوگا"

ماں "ان کو بشواش کیونکر آگیا۔ کہ گھر کے کسی آدمی نے روپے چرائے ہیں"۔

اہلیہ۔ "روپیہ کا لوبھ آدمی کو شکی بنا دیتا ہے"۔

۵

رات کے ایک بجے تھے۔ ڈاکٹر جے لال وحشتناک خوابوں کے نرغے میں پڑے ہوئے تھے۔ دفعتاً اہلیہ نے آکر کہا۔ ذرا چل کر دیکھو۔ جگیا کی کیا حالت ہو رہی ہے معلوم ہوتا ہے۔ زبان اینٹھ گئی۔ کچھ بولتی ہی نہیں۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

جے لال چونک کر اٹھ بیٹھے۔ ایک لمحہ تک اِدھر اُدھر تاکتے رہے گویا تحقیق کر رہے تھے۔ یہ بھی تو خواب نہیں ہے۔ تب بولے کیا کیا۔ "جگیا کو کیا ہو گیا؟"

بیوی نے پھر جگیا کی حالت بیان کی۔ جے لال کے چہرہ پر ایک ہلکا سا تبسم نظر آیا۔ بولے چور پکڑا گیا۔ موتھ نے اپنا کام کیا۔

بیوی "اور جو گھر کے کسی آدمی نے لئے ہوتے؟"

جے لال "تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ ہمیشہ کے لئے سبق مل جاتا"۔

بیوی "ڈھائی سو روپے کے پیچھے جان لے لیتے"۔

جے لال "ڈھائی سو روپیہ کے لئے نہیں۔ ضرورت پڑے۔ تو ڈھائی ہزار خرچ کر سکتا ہوں۔ صرف دغا بازی کی سزا دینے کے لئے"۔

بیوی "بڑے بے رحم ہو"۔

جے لال "تمہیں سر سے پاؤں تک سونے سے لاد دوں۔ تو مجھے نیکی کا پتلا سمجھنے لگو۔ کیوں؟ افسوس ہے کہ میں تم سے یہ سند نہیں لے سکتا"۔

یہ کہتے ہوئے وہ جگیا کی کوٹھری میں گئے۔ اس کی حالت اس سے کہیں زیادہ

خراب تھی۔ جو اہلیہ نے بیان کی تھی۔ اعضاء اکڑ گئے تھے۔ نبض کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُن کی ماں اسے ہوش میں لانے کے لئے بار بار اُس کے منہ پر پانی کی چھینٹے دے رہی تھی۔ بجے لال نے یہ حالت دیکھی۔ تو ہوش اُڑ گئے۔ انہیں اپنی تدبیر کے کارگر ہونے پر خوش ہونا چاہئے تھا۔ جگیا نے روپے چرائے۔ اس کے لئے مزید ثبوت کی ضرورت نہ تھی لیکن موٹھ ایسی سریع الاثر اور قاتل چیز ہے۔ اس کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ وہ چور کو ایڑیاں رگڑتے۔ درد سے کراہتے، اور تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہشِ انتقام غیر متوقع طور پر پوری ہو رہی تھی۔ مگر یہ وہ نمک کی کثرت تھی۔ جو لقمہ کو منہ کے اندر جانے نہیں دیتی۔ یہ نظارۂ درد دیکھ کر انہیں خوشی کی بجائے روحانی صدمہ ہوا۔ طیش میں ہم اپنی بیرحمی اور بیدردی کا مبالغہ آمیز اندازہ کر لیا کرتے ہیں۔ واقعہ تخیل سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جنگ کا تخیل کتنا شاعرانہ ہے۔ رزمیہ شاعری کتنی حرارت انگیز۔ مگر کچلی ہوئی لاشیں اور کٹے ہوئے اعضاء دیکھ کر کون بشر ہے جس کے رونگٹے نہ کھڑے ہو جائیں۔ بلاشبہ درد، انسان کی سرشت ہے!

اس کے علاوہ مجرم کی خستہ حالی نے اس جذبہ درد کو اور بھی متحرک کر دیا۔ جگیا جیسا وجود نحیف ان کے طیش کا شکار ہو گا۔ اس کا انہیں گمان نہ تھا۔ وہ سمجھے تھے۔ میرے انتقام کا وار کسی جاندار آدمی پر ہو گا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیوی اور لڑکے کو بھی اس وار کے قابل سمجھتے تھے۔ لیکن مرے کو مارنا۔ کچلے کو کچلنا انہیں اپنے شانِ انتقام کے خلاف معلوم ہوا۔ جگیا کی یہ حرکت معافی کے قابل تھی۔ جسے روٹیوں کے لالے ہوں، جو کپڑوں کو ترسے۔ جس کا خانہ آرزو ہمیشہ اندھیرا رہا ہو۔ جس کی خواہشیں کبھی مسکراتی نہ ہوں۔ اس کی نیت خام ہو جاتے تو تعجب کی بات نہیں

وہ فوراً دواخانہ میں گئے۔ بہترین ہوش آور ادویات کا ایک مرکب تیار کر لائے۔ اور جگیا کی حلق میں ڈال دیا۔ اس سے کچھ افاقہ نہ ہوا۔ تو برقی آلات لائے۔ اور ان کی مدد سے جگیا کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی۔ ایک لمحہ میں جگیا کی آنکھیں کھل گئیں اُس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے جے لال کو دیکھا جیسا لڑکا اپنے مدرس کی قمچی کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اُکھڑی ہوئی آواز میں بولی، ہائے رام کلیجہ پھنکا جاتا ہے۔ اپنے روپے لے لے، طاق پر ایک ہانڈی ہے۔ اس میں رکھے ہوئے ہیں مٹھی بھر روپیوں کے لئے مجھے آگ پر جلا رہا ہے۔ میں تمہیں اتنا کالا نہ سمجھتی تھی۔ ہائے رام!

یہ کہتے کہتے اُس پر غشی عارض ہوگئی نبض بند ہوگئی۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے اعضا میں تشنج ہونے لگا۔ جے پال نے بیکسانہ ندامت سے بیوی کی طرف دیکھا اور بولے میں تو اپنی ساری حکمت کر چکا۔ اب اسے ہوش میں لانا میرے امکان سے باہر ہے۔ میں کیا جانتا تھا کہ یہ کمبخت موٹھ اتنا قاتل ہوتا ہے۔ کہیں اس کی جان پر بن گئی تو ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔ ضمیر کے ٹھوکروں سے کبھی نجات نہ ملے گی۔ کیا کروں، کچھ عقل کام نہیں کرتی۔

اہلیہ۔ سول سرجن کو بلاؤ۔ شاید وہ کوئی اچھی دوا دیدے۔ کسی کو جان بوجھ کر آگ میں دھکیلنا نہ چاہیئے۔

جے لال۔ سول سرجن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ جو میں کر چکا۔ ہر لحہ اس کی حالت نازک ہوتی جاتی ہے۔ نہ جانے ظالم نے کونسا منتر چلا دیا۔ اس کی ماں مجھے بہت سمجھاتی رہی لیکن میں نے طیش میں اس کی باتوں کی ذرا پرواہ نہ کی۔

ماں۔ بیٹا۔ تم اسی کو بلاؤ جس نے منتر چلایا ہے۔ وہی اسے اُتار سکے گا۔ رات

تو بہت گئی ہے لیکن کیا کیا جائے گا۔ کہیں مر گئی تو ہتیا سر پر پڑے گی۔ خاندان کو ہمیشہ ستائے گی۔

۶

دو کا عمل تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں چبھی جاتی تھی۔ جے لال قدم بڑھاتے بدھو چودھری کے گھر کی طرف چلے جاتے تھے۔ اِدھر اُدھر بے سود نگاہیں دوڑاتے تھے۔ کہ کوئی یکہ یا ٹانگہ مل جائے۔ انہیں معلوم ہو رہا تھا۔ کہ بدھو کا مکان بہت دُور ہو گیا ہے۔ کتنی بار دھوکا ہوا۔ کہیں راستہ تو نہیں بھول گیا۔ کتنی بار اِدھر آیا ہوں۔ یہ باغیچہ کبھی نہ ملا۔ یہ لیٹر بکس بھی سڑک پر کبھی نہیں دیکھا۔ یہ پل تو ہرگز نہ تھا۔ ضرور راستہ بھول گیا۔ کس سے پوچھوں۔ وہ اپنی یادداشت پر جھنجلائے اور اُسی رو میں تھوڑی دُور تک دوڑے۔ معلوم نہیں ظالم اس وقت ملے گا بھی یا نہیں۔ شراب میں مست پڑا ہوگا۔ کہیں وہ غریب چل نہ بسی ہو۔ کتنی بار دوسرے راستوں پر گھوم جانے کا خیال ہوا لیکن تحریک باطن نے سیدھے راستے سے ہٹنے نہ دیا یہاں تک کہ بدھو کا مکان نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آئی۔ بدھو کے دروازے پر جاکر زور سے کُنڈی کھٹکائی۔ اندر سے ایک کتے نے ناشائستہ انداز سے جواب دیا۔ لیکن کوئی انسانی آواز نہ سنائی دی۔ پھر اور زور سے کیواڑ کھٹکھٹاتے۔ کتا اور بھی تند ہوا۔ بڑھیا کی نیند ٹوٹی۔ یہ کون اتنی رات گئے کیواڑ توڑے ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر۔ میں ہوں۔ جو تھوڑی دیر ہوئی تمہارے پاس آیا تھا۔

بڑھیا نے آواز پہچانی۔ سمجھ گئی ان کے گھر کے کسی آدمی پر آفت آئی انہیں تو اتنی رات گئے کیوں آتے۔ مگر ابھی تو بدھو نے موٹھ چلایا یا نہیں اس کا اثر کیونکر ہوا

سمجھاتی تھی۔ تب نہ مانا۔ خوب پھنسے۔ اُٹھ کر کُپی جلائی اور اسے لئے ہوتے باہر نکلی ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ بدھو چودھری سو رہے ہیں کیا۔ ذرا جگا دو۔

بڑھیا۔ نہ بابوجی۔ اس بکھت (وقت) میں نہ جگاؤں گی۔ مجھے کچا کھا جائیگا۔ رات کو لاٹ صاحب بھی آئیں تو نہیں اُٹھتا۔

ڈاکٹر صاحب نے چند لفظوں میں سارا ماجرا بیان کیا۔ اور بڑی منت کیساتھ التجا کی کہ بدھو کو جگاتے۔ اتنے میں بدھو خود ہی باہر نکل آیا۔ اور آنکھیں ملتے ہوتے بولا۔ کہتے۔ بابوجی۔ کیا حکم ہے؟

بڑھیا نے چڑکر کہا۔ تیری نیند آج کیسے کھُل گئی۔ جگانے گئی ہوتی تو مارنے اُٹھتا۔

ڈاکٹر۔ میں نے سارا ماجرا بڑھیا سے کہدیا ہے۔ انہیں سے پوچھو۔

بڑھیا۔ کچھ نہیں۔ تو نے موٹھ چلایا تھا۔ روپے ان کے گھر کی مہری نے لئے ہیں۔ اب اس کا اب تب ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ غریب مر رہی ہے۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ اُس کی جان بچ جائے۔

بدھو۔ یہ تو اب بڑی کُناتی۔ موٹھ کا پھیرنا سہج نہیں ہے۔

بڑھیا۔ ارے بیٹا۔ جان جوکھم ہے۔ کیا تجھے مالوم (معلوم) نہیں ہے۔ کہیں اُلٹے پھیرنے والے ہی پر پڑے تو جان بچنی مشکل ہو جائے۔

ڈاکٹر۔ اب اس کی جان تمہارے ہی بچائے۔ بچے گی۔ اتنا دھرم کرو۔

بڑھیا۔ دوسرے کی جان کھاتر (خاطر) کوئی اپنی جان گاڑھے میں ڈالیگا۔

ڈاکٹر۔ تم رات دن یہی کام کرتے رہتے ہو۔ تمہیں اس کے داؤں گھات سب معلوم ہیں۔ مار بھی سکتے ہو۔ جلا بھی سکتے ہو۔ میرا تو ان باتوں پر بالکل لشواش ہی نہ

تھا۔لیکن تمہارا کمال دیکھ کر دنگ رہ گیا تمہارے ہاتھوں کتنے ہی آدمیوں کا بھلا ہوتا ہے۔اس غریب بڑھیا پر رحم کرو"

بدھو کچھ پسیجا۔لیکن اس کی ماں معاملہ داری میں اس سے کہیں زیادہ فایق تھی۔اُسے خوف ہؤا۔کہیں یہ نرم ہوکر معاملہ نہ بگاڑ دے۔اس نے بدھو کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا۔بولی۔بابوجی۔یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہمارے بھی تو بال بچے ہیں نہ جانے کیسی پڑے۔کیسی نہ پڑے۔وہ تو ہمارے سر جاتے گی نا۔آپ تو اپنا کام نکال کر الگ ہو جائیں گے۔موٹھ پھیرنا دل لگی نہیں ہے"

بدھو"ہاں بابوجی۔کام بڑے جوکھم کا ہے"

ڈاکٹر"کام جوکھم کا ہے تو میں تم سے مفت تو نہیں کروانا چاہتا"

بڑھیا"آپ بہت دیں گے۔سو پچاس روپیہ دے دینگے۔اتنے میں ہم کے دن کھائیں گے۔موٹھ پھیرنا۔سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنا،آگ میں کودنا ہے بھگوان کی ایسی ہی نگاہ ہو تو جان بچتی ہے"

ڈاکٹر"تو ماتا جی،میں تم سے باہر تو نہیں ہوتا ہوں۔جو کچھ تمہاری مرضی ہو وہ کہو۔مجھے تو اس غریب کی جان بچانی ہے۔یہاں باتوں میں دیر ہو رہی ہے۔وہاں معلوم نہیں اُس کا کیا حال ہوگا"

بڑھیا"دیر تو آپ ہی کر رہے ہیں۔آپ بات پکی کر دیں۔تو آپ کے ساتھ جائیگا اور جو کچھ اس کے کئے ہو سکیگا۔کریگا۔آپ کی خاطر یہ جوکھم اپنے سر لے رہی ہوں۔دوسرا ہوتا تو ٹکا سا جواب دے دیتی۔آپ کے ملاحجے (ملاحظے) میں پڑ کر جان بوجھ کر جہر (زہر) پی رہی ہوں"

ڈاکٹر صاحب کو ایک ایک لمحہ ایک ایک برس معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بدھو کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ کہیں اس کا دم نکل گیا۔ تو یہ جا کر کیا بنائے گا۔ اس وقت ان کی نگاہوں میں روپیہ کی کوئی قیمت نہ تھی۔ صرف یہی فکر تھی۔ کہ جگیا موت کے منہ سے نکل آتے جس روپیہ پر وہ اپنی ضرورتیں اور آسائشیں اپنے گھر والوں کی خوشی اور خواہش تصدق کرتے تھے۔ اُسے جذبۂ درد نے بالکل ناچیز بنا دیا تھا۔ بولے تمہیں بتلا دو۔ اب میں کیا کہوں۔ مگر جو کچھ کہنا ہو فوراً کہدو۔

بڑھیا۔ اچھا، تو پانسو روپیہ دے دیجئے۔ اس سے کم میں کام نہ ہوگا۔

بدھو نے ماں کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اور ڈاکٹر صاحب کو تو سکتہ سا ہو گیا مایوسانہ انداز سے بولے۔ اتنا تو میرے قابو سے باہر ہے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تقدیر میں مرنا ہی لکھا ہے۔

بڑھیا۔ تو جانے دیجئے۔ ہمیں اپنی جان بھاری تھوڑے ہی ہے۔ ہم تو آپ کے ملا ہجے (ملاحظے) سے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جاؤ بدھو، سوؤ۔

ڈاکٹر۔ بوڑھی ماتا۔ اتنی بے رحمی نہ کرو۔ آدمی کا کام آدمی ہی سے نکلتا ہے۔

بدھو۔ نہیں بابوجی میں ہر طرح سے آپ کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ اُس نے پانسو کہے۔ آپ کچھ کم کر دیجئے۔ ہاں جوکھم کا دھیان رکھئے گا۔

بڑھیا۔ تو جا کے سوتا کیوں نہیں۔ انہیں روپے پیارے ہیں۔ تو کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں ہے۔ کل کو لہو تھوکنے لگے گا۔ تو کچھ بنائے نہ بنے گی۔ بال بچوں کو کس پہ چھوڑ لیگا۔ گھر میں کچھ......

ڈاکٹر صاحب نے شرماتے ہوئے ڈھائی سو روپے کہے۔ بدھو راضی ہو گیا معاملہ

طے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اُسے ساتھ لے کر گھر کی طرف چلے۔ انہیں ایسی روحانی مسرت کبھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ ہارا ہوا مقدمہ جیت کر عدالت سے لوٹنے والا مقدمہ باز بھی اتنا خوش نہ ہوتا ہوگا۔ لپکے چلے جاتے تھے۔ بدھو سے بار بار قدم بڑھانے کو کہتے۔ گھر پہنچے تو جگیا کو نزاع کی حالت میں پایا معلوم ہوتا تھا۔ دم واپسیں ہے۔ ان کی ماں اور بیوی دونو باچشمِ تر مایوس بیٹھی ہوئی تھیں۔ بدھو کو دونوں نے منت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے آنسو بھی نہ رُک سکے۔ بڑھیا کے سر کی طرف جھکے تو اشک کے کئی قطرے اس کے مرجھاتے ہوئے زرد رخساروں پر ٹپک پڑے۔ بدھو کی فراست اب بیدار ہوئی۔ بڑھیا کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ بابو جی۔ اب پیسے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ دم توڑ رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گڑگڑا کر کہا۔ نہیں چودھری۔ ایشور کے لئے اپنا منتر چلاؤ۔ اس کی جان بچ گئی تو میں ہمیشہ کے لئے تمہارا غلام بنا رہونگا۔

بدھو۔ آپ مجھ سے جان بوجھ کر جہر (زہر) کھانے کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ موٹھ کے دیوتا اس بکھت (وقت) اتنے گرم ہیں۔ وہ میرے من میں بیٹھے کہہ رہے ہیں تم نے ہمارا شکار چھینا تو ہم تجھے نگل جائیں گے۔

ڈاکٹر۔ دیوتا کو کسی طرح راضی کر لو۔

بدھو۔ مشکل سے راضی ہونگے۔ پانچسو روپے دیجئے تو اس کی جان بچے۔ اُتارے کیلئے بڑے بڑے جتن کرنے پڑینگے۔

ڈاکٹر۔ پانچسو روپے دیدوں تو اس کی بچا دوگے۔

بدھو۔ ہاں۔ شرط بدکر۔

ڈاکٹر صاحب بجلی کی طرح لپک کر اپنے کمرے میں گئے اور باقی پانچسو روپیوں کی تھیلی لا کر بدھو کے سامنے رکھ دی۔ بدھو نے فاتحانہ نظروں سے تھیلی کو دیکھا۔ تب جگیا کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ بُد بُدا کر چھُو چھُو کرتا جاتا تھا۔ ایک لمحہ میں اس کی صورت وحشت ناک ہو گئی۔ آنکھوں سے شعاعیں سی نکلنے لگیں۔ بار بار انگڑائیاں لینے لگا۔ اسی عالم میں اس نے ایک بے سُرا گیت گانا شروع کیا۔ مگر ہاتھ جگیا کے سر پر ہی تھے۔ آخر آدھ گھنٹے میں بڑھیا نے آنکھیں کھول دیں۔ جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جاتے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت رو بہ اصلاح ہونے لگی۔ اور مرغ کی پہلی بانگ سنائی دی۔ اِدھر بڑھیا نے ایک انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھی۔ گویا اس بانگِ سحر نے اُسے بیدار کر دیا۔

۷

سات بجے تھے جگیا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ بشاش تھا۔ بدھو روپیوں کی تھیلی لے کر ابھی ابھی رخصت ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ماں نے کہا بات کی بات پانچ سو روپیہ مارے گیا۔ ڈاکٹر یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ایک مُردہ کو جلا گیا۔ کیا اس کی جان کی قیمت اتنی بھی نہیں ہے۔

ماں۔ دیکھو طاق پر ہانڈی میں ڈھائی سو روپیہ ہیں یا نہیں

ڈاکٹر۔ نہیں۔ ان روپیوں میں ہاتھ مت لگانا۔ انہیں وہیں پڑا رہنے دو۔ اس نے تیرتھ کرنے کے لئے لئے تھے۔ وہ اسی کام میں خرچ ہونگے۔

ماں۔ یہ ساڑھے سات سو روپے اسی کے بھاگ کے تھے۔

ڈاکٹر۔ اسکے بھاگ کے تو ڈھائی سو ہی تھے۔ باقی میرے بھاگ کے تھے۔ انکی بدولت مجھے ایسا سبق مل گیا۔ جو عمر بھر نہ بھولیگا تم اب مجھے جائز خرچ میں مٹھی بند کرتے ہوتے نہ پاؤ گی۔

شُدّھی

آخر جو ہونا تھا۔ وہی ہؤا۔ لالہ پریم ناتھ کو اپنا سب کچھ کھو چکنے کے بعد آخر کار معلوم ہؤا۔ کہ بازار حسن میں وفا کی جنس عنقا ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گذرے وہ احباب میں زاہد خشک مشہور تھے مگر ایک دن دوستوں کے اصرار سے ایک محفل میں شریک ہوتے اور بی حسنہ کے حسن زاہد فریب نے وہیں مجمع عالم میں ان کا دل لوٹ لیا۔ رنگین مزاجوں کیلئے حسن اور ادا مشغلہ تفریح ہے۔ زاہدوں کے لئے پیغام شہادت۔ ان پانچ برسوں میں پریم نواس نے دولت۔ عزت۔ دین۔ ایمان سب کچھ بی حسنہ کی نذر کر دیا۔ اگر وہ چھپے چھپے محسنہ کی پرستش عمر بھر کیا کرتے۔ تو کوئی باز پُرس نہ ہوتی۔ لیکن علانیہ کھُلے بندوں۔ ڈنکے کی چوٹ رنگ رلیاں منانا سماج کو کب برداشت ہو سکتا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہو گئی۔ اعزہ بیگانے ہو گئے۔ انہیں دیکھ کر کترا جاتے۔ ماں نے رو رو کر سمجھایا۔ بیوی نے منتیں کیں۔ دانہ۔ پانی چھوڑا۔ مگر پریم نواس کے دل میں حسنہ کے سوا اور کسی کے لئے اب جگہ نہ تھی۔ یہاں تک آخر ماں مجبور ہو کر تیر تھ جاترا کرنے چلی گئی اور گومتی نے میکے کی راہ لی۔ پریم نواس کا راستہ اور بھی صاف ہو گیا۔ عطائیوں اور میراثیوں کی صحبت رہنے لگی۔ مذہبی پابندیاں پہلے ہی شاخ پر جا بیٹھی تھیں۔ اب ان کے پر نکل آئے۔ اُڑ گئیں ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوتے۔ بغیر لطف صحبت کہاں۔ خلوص میں امتیاز کہاں؟ الفت میں مغائرت کیسی؟ چھوت چھات کے مٹتے ہی ان کا ہندوپن بھی

مٹ گیا۔ جب ہندو نہ رہے۔ تو مسلمان، عیسائی، جو چاہے کہو۔ جو چاہے سمجھو۔ ماں اور بیوی کی کنارہ کشی نے بغاوت کی۔ اور پھر بھی تحریک کی۔ ایک دن جامع مسجد میں کلمہ پڑھ لیا۔ انہیں اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔ جذبات ہندو تھے۔ خیالات ہندو تھے۔ تعلقات ہندو تھے۔ ہمدردیاں ہندو تھیں لیکن آداب ہندو نہ تھے اسلئے وہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اُٹھنا۔ بیٹھنا۔ کھانا۔ پینا کیا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل قاطع نہ تھی۔ پر اس سے فائدہ ہی کیا۔ کہ نہ اِدھر میں نہ اُدھر میں۔ کلمہ پڑھتے ہی پریم نواس اُلفت حسین بن گئے۔

لیکن اس کوچہ میں کون صاحب زر آیا جو چند دنوں ہی میں دانوں کو محتاج نہ ہو گیا ہو۔ دنیا کے بازار میں نقد جنس کی صورت اختیار کرتی ہے۔ نشاط کے باغ میں رندی اور فاقہ مستی کے سوا اور کیا ہے۔ شمع بجھتے ہی پروانے منتشر ہو گئے۔ نخل بے ثمر پر طیور کیوں چہکیں۔ باوا آدم کے زمانے سے جو ہوتا ہے۔ وہی پھر ہوا۔ حسنہ نے نئے عاشق ڈھونڈ نکالے۔ اور میاں اُلفت حسین بے یار و مددگار۔ بے رفیق و غمگسار۔ ایک پُرانی مسجد میں پناہ گزین ہوئے۔ ساری دولت خرچ کر کے رسوائی۔ ندامت۔ ذلت اور عسرت جیسی بے بہا چیزیں خرید لائے۔ بیماری گھاتے میں ملی۔

۲

اب پریم نواس کی آنکھیں کھلیں۔ تین ہفتہ سے مسجد کے گوشے میں پڑا کراہ رہا تھا پر کوئی پُرساں حال نہ تھا۔ پرانے دوست اس کی آشفتہ سری سے مایوس ہو کر اُس کے نام سے رو بیٹھے تھے۔ نئے دوستوں میں ہنسنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اِس ہیبت کذائی میں پریم نواس کو پیاری ماں اور مہربان بیوی کی یاد آئی۔ آہ۔ کتنی

قابلِ رشک زندگی تھی۔ کیا بیقاری کے دن تھے۔ وہ عصمت کی دیوی مجھے کتنا سمجھاتی رہی پر میں ہوس کے نشہ میں بیخود ہو رہا تھا۔ کاش ایک بار پھر اس دیوی سے مل جاتا۔ تو زندگی بھر اس کے قدموں سے جدا نہ ہوتا۔ مگر اب ایسے نصیب کہاں۔ اب مجھے کون پوچھیگا۔ گومتی کو تو میری صورت سے نفرت ہو گئی ہو گی۔

مسجد میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ طاہر علی نام تھا بے لوث آدمی تھے انہیں پریم نواس کی حالت پر رحم آتا تھا۔ اپنے کھانے میں انہیں شریک کر لیتے ایک دن ان سے کہا۔ کیوں اپنے گھر نہیں چلے جاتے۔ یہاں کب تک پڑے رہو گے آخر گھر تو نہیں گر گیا۔ میں دیکھتا ہوں۔ یہاں تمہاری حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے

پریم نواس نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ کیوں جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ مولوی صاحب میرا اب گھر بار کہاں۔ گھر تو کب کا بک چکا ہے۔ اب تو قبر ہی میں عافیت نصیب ہو گی

طاہر۔ بھلا ایک بار اپنے گھر والوں کو بلاؤ تو۔ دیکھو۔ کیا جواب آتا ہے بیوی کو تو میں نہیں کہتا۔ لیکن ماں بچے کی یہ حالت دیکھ کر اس کے سارے قصور معاف کر دے گی اور چھاتی سے لگا لے گی۔

پریم نواس نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اتنا جانتا ہوں مولوی صاحب۔ اماں کو خبر مل جائے تو وہ چاہے کہیں ہوں دوڑی چلی آئیں گی۔ بیوی کی جانب سے بھی مجھے اس کا کامل یقین ہے۔ وہ وفا کی دیوی ہے۔ مولوی صاحب! ایسی شرم و حیا تو میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔ مگر کہوں کس منہ سے جاؤں کیسے۔ اب انہیں یہ روئے سیاہ نہیں دکھا سکتا۔ یہیں پڑے پڑے مر جانا قبول ہے۔ ان کے غم کو تازہ نہیں کر سکتا۔ آہ! میں ننگِ خاندان ہوں۔ مولوی

صاحب! میں نے بزرگوں کا نام ڈبو دیا۔ میرے پاس اتنا اثاثہ تھا۔ کہ کئی پیڑھیوں تک فراغت سے گذران ہوتی لیکن اب قلاش ہوں۔ یہاں تک کہ ہمت کی لکڑی بھی ہاتھ میں نہیں ہے۔ اب تو ایشور سے یہی دعا ہے کہ جتنی جلد ہو سکے۔ میری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیں۔

مولوی صاحب نے ترش ہو کر کہا۔ ایشور کیوں خدا کہو صاحب۔

پریم نواس حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ آپ کے لئے خدا اور ایشور دو ہونگے جناب میرے لئے ایک ہیں۔ دُنیا ساجھے کی کھیتی نہیں۔ جسے ایشور۔ خدا۔ برمھ۔ لارڈ اور جہوا نے مل کر لگائی ہو۔

مولوی صاحب نادم ہو کر بولے۔ بات تو یہی ہے برادر۔ ہاں ایک وجود کا جو نام ہمیشہ سُنتے آتے ہیں۔ اس کی بجائے کوئی دوسرا نام سُنتے ہیں تو وہ ذرا کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ خیر کہو۔ تو تمہارے سسرال ایک خط لکھ دوں۔

پریم نواس نے ہاتھ ملا کر منع کرتے ہوئے کہا۔ ہرگز نہیں۔ مجھے یہیں مرنے دیجئے۔ میرے اعمال کی یہی سزا ہے۔ مرنے کے بعد گور و کفن کی فکر کوئی کرہی دیگا۔ اس وقت البتہ ایک خط ڈال دیجئے گا۔ کہ بدنصیب پریم نواس ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور اب جہنم کی اذیتیں جھیل رہا ہے۔ مرنے میں اب بہت دیر نہیں۔ طاہر علی زیادہ سے زیادہ دو دن میرے سسرال لکھنؤ میں ہے۔ محلہ توابتہ۔ میرے سسر کا نام بابو نہال چند ہے۔ مگر بھائی جان خدا کے لئے مرنے سے پہلے خط نہ لکھئے گا۔ آپ کو خدا کی قسم ہے۔ اس روئے سیاہ کی اب کفن ہی پردہ پوشی ہو گی۔

۳

تیسرے دن کوئی پہر رات گئے۔ دو عورتیں مسجد کے سامنے آکر کھڑی ہوئیں۔ ایک مزدورنی تھی۔ دوسری گومتی۔ دونوں مسجد کی طرف تاک رہی تھیں۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گومتی آہستہ سے بولی۔ یہاں کوئی ہے کہ نہیں۔ پوچھو یہی رحیم خاں کی مسجد ہے نہ

مزدورنی نے کہا کس سے پوچھوں کوئی دکھائی بھی تو دے (مولوی کو دیکھ کر)۔ ارے میاں صاحب! یہی رحیم خاں کی مسجد ہے نہ۔

طاہر علی ان دونوں کو دیکھتے ہی لپک کر اندر آئے۔ اور پریم نواس سے بولے اُلفت حسین' اُلفت حسین۔ سو گئے کیا؟ تمہارے گھر کے لوگ آ گئے۔

پریم نواس اُٹھ کر بیٹھا ہی نہیں کھڑا ہو گیا۔ اور اضطراب کے عالم میں دو قدم آگے بڑھ کر پھر رُک گیا۔ اور تعجب سے بولا۔ میرے گھر کے لوگ! خواب دیکھا ہے کیا؟

طاہر۔ خواب نہیں ہے۔ جناب حقیقت ہے۔ ضرور تمہارے گھر والے ہیں۔ بلا لاؤں؟ ایک بڑھیا نے مجھ سے پوچھا۔ یہی رحیم خاں کی مسجد ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سوچا پہلے تمہیں خبر دیدوں۔

پریم نے انداز ملامت سے دیکھ کر پوچھا۔ تم نے خط تو نہیں لکھ دیا تھا؟

طاہر علی نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ ہاں بھئی لکھ تو دیا ۔ مجھ سے تمہاری حالت دیکھ کر نہ رہا گیا۔

پریم۔ میں نے تو تمہیں قسم رکھا دی تھی۔ پھر بھی تم نے نہ مانا۔ مجھے تم سے اس کمینہ پن کی امید نہ تھی۔ میں اسے صریح کمینہ پن اور دغا سمجھتا ہوں۔

گالیاں پھر دے لینا بھئی۔ اس وقت کیا کہتے ہو۔ بلا لاؤں نہ! ذرا بھلے

آدمی کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو۔ کہ ان لوگوں کو اُول جلول بکنے لگو۔

پریم نہیں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہدو یہاں کوئی نہیں ہے۔

طاہر۔ ذرا سوچ لو۔

پریم۔ کون۔ اگر تم کسی کو یہاں لاتے۔ تو میں اسی کنوئیں میں کود پڑوں گا۔ بڑے ذلیل آدمی ہو۔ بنتے تو ہو بڑے پارسا۔ مگر چھپے ہوئے گرگے۔

بڑھیا مزدورنی نے مسجد کے دروازے پر آکر پوچھا۔ ارے میاں صاحب رحیم خان کی یہی مسجد ہے۔ کب سے کھڑی بھونک رہی ہوں۔ کوئی بولتا ہی نہیں۔

طاہر (پریم سے) ابھئی اس وقت مجھ پر رحم کرو۔ اگر میں جانتا کہ تم اپنے جامہ سے باہر ہو جاؤ گے۔ تو بھول کر بھی نہ لکھتا (بڑھیا سے) ہاں یہی ہے رحیم خاں کی مسجد۔ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا۔ لکھنؤ سے آئی ہوں۔ بابو پریم نواس کے سسرال سے۔ بہوجی آئی ہیں۔ بابو صاحب کہاں ہیں؟

پریم (طاہر سے) طاہر علی۔ تم نے میرے ساتھ بڑی دغا کی۔ سچ کہتا ہوں۔ اِس وقت میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی۔ تو تمہاری گردن ضرور توڑ دیتا۔ ظالم! ذرا تو سوچا تھا کہ اس دیوی کے روبرو یہ کیسے جائیگا۔ کیسے کیا ہوگا۔

طاہر۔ بھائی جان معاف کرو۔ سخت غلطی ہوئی۔ حق تو یہ ہے۔ کہ مجھے ان کے آنے کی امید نہ تھی۔

پریم۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گومتی میری حالت کی خبر پاکر ضرور چلی آئے گی۔ خیر اب تو امتحان لے چکے۔ معلوم ہو گیا۔ کہ ہندو عورت کتنی وفادار ہوتی ہے۔

اب آپ جا کر خدا کے لئے کہہ دیجئے۔ کہ پریم نواس یہاں نہیں ہیں۔ اور کچھ پوچھیں تو کہہ دینا۔ کہ دوپہر تک یہاں تھے۔ مگر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

طاہر علی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ بھائی جان مجھ پر رحم کرو۔ ایک عفیفہ کے ساتھ دغا کرنے کے لئے مجھے مجبور نہ کرو۔ جو تم کہتے ہو۔ وہ میرے منہ سے نہیں نکل سکتا۔

پریم نواس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس مُلّا نے کے دل میں کتنا درد۔ کتنا خلوص کتنی ہمدردی ہے! مولوی صاحب کی طرف احسان مندانہ نگاہ سے دیکھ کر بولے۔ جائیے بلا لائیے۔ کہہ دیجئے۔ بدنصیب پریم نواس یہیں ہے۔ طے تو کر چکا تھا۔ کہ گھر والوں کو صورت نہ دکھاؤں گا۔ ایسی جگہ مرنا چاہتا تھا۔ جہاں کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہو لیکن ایشور کو میری ایسی پُر سکون موت بھی منظور نہ تھی۔

۴

کتنا دردناک منظر تھا۔ گومتی کھڑی تھی۔ پریم نواس اس کے پیروں پر سر جھکائے ہوئے تھا۔ اور باوجود گومتی کی پُر زور مدافعت کے سر نہ اٹھاتا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ زبان دونوں کی بند۔ جذبات کے طوفان میں الفاظ ڈگمگاتے ہوئے چلتے تھے۔ پر ناطقہ تک پہنچتے پہنچتے غرقاب ہو جاتے تھے۔

آخر گومتی نے سسکتے ہوئے کہا۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے مولوی صاحب خط نہ لکھتے تو مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ ہم ایسے غیر ہو گئے۔

پریم نواس نے سر اٹھایا اور رقت انگیز لہجہ میں کہا۔ معاف کرو گومتی۔ میری خطا معاف کرو۔ اپنی نادانی کا خوب مزا چکھ چکا۔ ارادہ تو یہی تھا۔ کہ تمہیں خبر نہ ہو۔ اور دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مگر تقدیر میں یہ ذلت اور شرمندگی بدی تھی۔

گومتی بیٹھ گئی۔ اور شوہر کی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ذلت اور شرمندگی کیسی؟ کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ میرا الشیور جانتا ہے۔ کہ میں تمہیں پہلے جو سمجھتی تھی۔ وہی اب سمجھتی ہوں۔ بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ دولت کا کیا غم؟ تقدیر میں ہوگی۔ پھر مل رہے گی۔ میرے لئے تمہاری خدمت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ سہاگ عورت کے لئے سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن میں تمہیں کیونکر چھوڑ دیتی۔ میں تو ہمیشہ کے لئے تمہاری ہوں۔

پریم نواس نے مشتبہ انداز سے کہا۔ پر یہ کیسے ہوگا۔ گومتی۔ ہمارے درمیان تو ایک آہنی دیوار کھڑی ہے۔ دُنیا مجھے مسلمان کہتی ہے۔ اور مسلمان سمجھتی ہے۔ حالانکہ میں سچے دل سے کہتا ہوں۔ مجھے اسلام سے کبھی عقیدت نہ تھی۔ مجھے مرجانا قبول ہے۔ پر تمہیں رسوا نہیں کر سکتا۔

اس خیال سے پریم نواس کے دل پہ ٹھیس لگی۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے ضبط کر کے پوچھا۔ ایک بات پوچھوں۔ بتلاؤ گی۔ گومتی سچ کہنا۔

گومتی۔ کیا بات ہے۔ کہو۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولتی۔

پریم۔ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ تمہیں مجھ سے نفرت تو ضرور ہوگی؟

پریم نواس نے شرم سے سر جھکا لیا۔ یہ سوال بے موقع تھا۔ یہ بات اس سے چھپی نہ تھی۔ اس کا جواب گومتی کے لئے کتنی روحانی کوفت کا باعث ہوگا۔ یہ بھی وہ جانتا تھا۔ تاہم وہ گومتی کے چہرے کی طرف جواب کے لئے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

گومتی نے سر جھکاتے ہوئے مگر دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ بہتر ہوتا کہ تم مجھ سے یہ سوال نہ کرتے۔ پیارے اگر میں کئی سال غائب رہنے کے بعد تمہارے پاس آتی۔ تو تمہارے دل میں میری جانب سے جو کچھ خیال ہوتے۔ ان سے میرے دل کا اندازہ کر سکتے ہو۔ دل تمہاری طرف دوڑتا ہے۔ مگر جسم پیچھے ہٹتا ہے۔ میں تمہارے لئے اس وقت بھی جان قربان کر سکتی ہوں لیکن.......

گومتی خاموش ہو گئی۔ اپنے اظہار حال کے لئے اسے مناسب الفاظ نہ ملے پریم نواس اس جھجک کا مطلب سمجھ کر جوش سے بولا۔ میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ گومتی! اور خوش ہوں کہ تم نے اسے ظاہر کر دیا۔ آپس میں کسی طرح کا پردہ نہ چاہیئے میری شدھی تو ہو سکتی ہے۔ کیا تب بھی تمہیں مجھ سے احتراز ہوگا۔ میں شدھی کا حامی نہیں ہوں۔ گومتی۔ ہندو سماج میں اب بھی ایسے بیشمار آدمی پڑے ہوتے ہیں جن کے ہاتھ کا پانی پینا مجھے گوارا نہ ہوگا۔ ہمارا سماج ایسے ہی آدمیوں سے بھرا ہؤا ہے لیکن ان کے ساتھ ملنے کے لئے میں اپنی شدھی کرانی شرمناک سمجھتا ہوں۔ لیکن تمہاری خاطر مجھے یہ آزمائش بھی قبول ہے۔

گومتی نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تو کب؟

پریم نواس بولے۔ جب تمہارا جی چاہے۔

شطرنج کی بازی

نواب واجد علیشاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہُوا تھا چھوٹے۔ بڑے۔ امیر و غریب سبھی رنگ رلیاں منا رہے تھے کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ امورِ سیاست میں۔ شعر و سخن میں۔ طرزِ معاشرت میں حرفت و صنعت میں۔ تجارت و تبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت میخواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعرا بوسہ و کنار میں مست۔ اہلِ حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں اہلِ سیف تیتر بازی میں ۔ اہلِ روزگار سرمہ و مسی۔ عطر و تیل کی خرید و فروخت کا دلدادہ۔ غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہُوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہُوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ علم و حکمت کن کن ایجادوں میں مصروف ہے۔ بر و بحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی تھیں کہیں چوسر ہو رہی ہے۔ پو بارہ کا شور مچا ہُوا ہے۔ کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے نئے نئے نکلے۔ نئے نئے نسخے سوچے جاتے

تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے ارباب نشاط سے تلمذ کرتے تھے۔ فکر کو جولاں عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لئے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اُس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اِس لئے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انہیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکر و معاش سے آزاد تھے۔ آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوع سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کرکے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے۔ پھر انہیں خبر نہ ہوتی تھی۔ کہ کب دوپہر ہوا کب سہ پہر، کب شام گھر میں سے بار بار آدمی آکر کہتا تھا۔ کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا۔ چلو آتے ہیں۔ دسترخوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے ہی میں رکھ جاتا تھا۔ اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ کرکے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا۔ اس لئے انہیں کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے۔ ہرگز نہیں۔ محلہ کے گھر کے نوکر چاکروں میں مہریوں، ماماؤں، میں بڑا حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے۔ گھر کو تباہ کر

کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے۔ نہ دنیا کے کام۔ بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ برا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں حالانکہ انہیں اس کے موقع مشکل سے ملتے وہ سوتی ہی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی رات کو سو جاتی تھیں تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے غصہ داڑھی پر اتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں۔ کہہ دو آکر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جاکر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو۔ بگاڑو ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا۔ تو ماما سے کہا۔ جاکر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لاویں۔ دوڑ جلدی کر۔ سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی تو مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جاکر کہہ کہ ابھی چلئے۔ ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ کچھ ان کے آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوتی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب چھو منتر کر دیں گے۔ کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر

رفع ہو جائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا۔"ارے تو جا کر سن ہی آیئے نہ! عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں۔"

مرزا۔ جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔

میر۔ جی اس بھروسے نہ رہیے گا۔ وہ چال سوچی ہے۔ کہ آپ کے مہرے دھرے رہیں اور مات ہو جائے۔ پر جایئے۔ سُن آیئے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لئے ان کا دل دکھایئے گا۔

مرزا۔ جی چاہتا ہے۔ اسی بات پر مات کر دوں۔

میر۔ میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جا کر سن آئیں۔

مرزا۔ ارے یار جانا پڑے گا۔ حکیم کے یہاں۔ درد ورد خاک نہیں ہے مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر۔ کچھ بھی ہو ان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا۔ اچھا۔ ایک چال اور چل لوں۔

میر۔ ہرگز نہیں۔ جب تک آپ سُن نہ آئیں گے۔ میں مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا۔"تمہیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے۔ کہ چاہے کوئی مر ہی جائے۔ پر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا۔ کیا کروں۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر

آیا ہوں۔

بیگم۔ کیا جیسے خود نکھٹو ہیں۔ ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں ان کے بھی تو بال بچے ہیں۔ کر سب کا صفایا کر دیا۔

مرزا۔ بڑا لتی آدمی ہے جب آ کر سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ دُتکار کیوں نہیں دیتے کتّے کی طرح۔

مرزا۔ سبحان اللہ۔ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ تو میں ہی دُتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے۔ ہو جائیں۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی۔ اپنا سہاگ لیں گی (ماما سے) عباسی شطرنج اٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا۔ میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں اب پھر منہ نہ دکھائیے گا۔

مرزا۔ ہائیں ہائیں۔ کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کراؤ گی کیا۔ ٹھہر عباسی۔ کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے میرا ہی خون پئے جو روکے۔ اچھا اسے روک لیا مجھے روک لے تو جانوں۔ یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود جھلائی ہوتی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لئے تمہیں شہید کربلا کی قسم۔ میری ہی میت دیکھے۔ جو ادھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی۔ دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب

جاتے ہوتے پیر رُک گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا۔ حسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا میر صاحب نے حسبِ ضرورت دو چار مہرے تبدیل کر دیئے تھے۔ اور اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لئے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ پھر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مُراد ملی۔ اندر پہنچ کر بازی الٹ دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے۔ کچھ باہر تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی۔ مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی چھنکار سُنی تو سمجھ گئے۔ بیگم صاحبہ بگڑ گئیں چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ تم نے غضب کر دیا۔

بیگم۔ اب موا اِدھر آتے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ سمجھ لیا ہے اتنی لو اگر خدا سے لگاتے تو ولی ہو جاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں ہیں یہاں چولہے چکی میں سر کھپاؤں۔ لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جانے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہونچے تو (معذرت آمیز لہجہ میں) با دلِ پُر درد سارا ماجرا کہہ سُنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے۔ اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا۔ جب دردِ سر کا پیغام ماما لائی تھی۔ کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں اُف! اتنی تمکنت! آپ نے انہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انہیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے۔ مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انہیں کیا مجال! میرے یہاں دیکھئے۔ کبھی

کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا۔ خیر اب یہ تو بتایئے اب کہاں جماؤ ہوگا؟

میر۔ اس کا کیا غم ہے۔ اتنا بڑا گھر پڑا ہؤا ہے۔ بس یہیں جمے گی۔

مرزا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا۔ تب تو اتنی خفگی تھی۔ گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر۔ اجی بکنے دیجئے۔ دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی ہاں آپ بھی ذرا تن جایئے۔

۲

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لئے وہ ان کے مشغلہ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی۔ یا کچھ السانے۔ تو سرد و بہ مستاں یاد دہانیدن کے مصداق اُنہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہو گیا تھا۔ کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج پیدا ہونے لگا۔ تو اُنہیں بڑی تشویش دامنگیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ پر جھانکنے کو ترس جاتی تھیں سوچنے لگیں۔ کیونکر یہ بلا سر سے ٹلے۔

اِدھر نوکروں میں بھی کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آتے کوئی جاتے۔ ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی

پانی لانے کا کبھی برف لانے کا کبھی تمباکو بھرنے کا۔ حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے۔ جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے۔ کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلہ والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں۔ مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کیا کروں؟ میرا کیا بس ہے؟

محلہ میں دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے۔ وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اب خیریت نہیں۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے۔ تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہو گی۔ چھن بُرے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دھاڑے لٹتی تھی پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھچی چلی آتی تھی۔ اور یہاں سامان عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ۔ نقال۔ کتھک۔ ارباب نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی۔ یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی نہ ادا ہو سکتا تھا۔ رزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا

دھمکیاں دیتا مگر یہاں لوگوں پر نفس پرودری کا نشہ سوار تھا کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گذر گئے۔ نت نئے نئے نقشے حل کئے جاتے۔ نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کئے جاتے۔ کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہوجاتی۔ تو تو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر رنجیاں بہت جلد دفع ہو جاتی تھیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے۔ میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آبیٹھتے۔ اور قسمیں کھاتے۔ کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے۔ مگر صبح ہوتے ہی دونو دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دُور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آپہنچا میر صاحب کے حواس اڑے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لئے۔ اور نوکروں سے کہا۔ کہدو گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں کہیں چھپے بیٹھے ہونگے۔

خدمتگار۔ میں یہ نہیں جانتا۔ گھر میں سے یہی جواب ملا ہے۔ کیا کام ہے؟

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لئے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں۔ جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمتگار۔ اچھا تشریف لے جائیے۔ کہہ دیا جائیگا۔

سوار۔ کہنے سننے کی بات نہیں ہے۔ میں کل فوراً آؤنگا۔ اور تلاش کر کے

لے جاؤنگا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہؤا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی بولے۔ اب کیا ہو گا۔

مرزا۔ بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر۔ کمبخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا۔ قہر آسمانی ہے۔ اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوتی تو بن موت مرے یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔

میر۔ یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھئے۔

مرزا۔ بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملتے ہی نہیں۔ دونوں آدمی غائب ہو جائیں۔ سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہو گی۔ حضرت آکر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جائیں گے۔

میر۔ بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں تم نے خوب بہروپ بھرا۔

اُس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے صبح کا گیا پھر رات کو آئیگا۔

۳

اُس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دباتے۔ ڈبے میں گلوریاں بھرے۔ گومتی پار ایک

پُرانی ویران مسجد میں جا بیٹھے۔ جو شاید عہدِ مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم۔ تمباکو، مدریا لے لیتے۔ اور مسجد میں پہنچ۔ دری بچھا۔ حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھے۔ پھر انہیں دین و دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت۔ شہ پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ کوئی چلہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی۔ تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نان بائی کی دوکان پر کھانا کھا لیتے۔ اور ایک چلم حقہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی سدھ بھی نہ رہتی تھی۔

اُدھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جاتی تھیں کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غمِ دُزدا اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے۔ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جاتے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت دکھائی نہ دیتی تھیں یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب انہیں کشت پر کشت دے رہے تھے۔ کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سامنے سڑک پر سے آتی ہوتی دکھائی دی کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب۔ انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔

مرزا۔ آنے دیجیے۔ کشت بچایئے۔ یہ کشت۔

میر۔ ذرا دیکھنا چاہیے۔ آڑ سے دیکھیں۔ کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔ دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مرزا۔ دیکھ لیجیے گا۔ کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر۔ توپ خانہ بھی ہے۔ کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ سرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مرزا۔ جناب حیلے نہ کیجیے۔ یہ کشت۔

میر۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجیے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا۔ تو گھر کیسے چلیں گے۔

مرزا جب گھر چلنے کا وقت آئیگا۔ تو دیکھی جائیگی۔ یہ کشت اور مات! فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسے رہے گی۔

میر۔ آج روزہ ہے۔ کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے؟

مرزا۔ جی نہیں۔ شہر میں نہ معلوم کیا ہو رہا ہوگا؟

میر۔ شہر میں کچھ نہ ہو رہا ہوگا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہونگے۔ حضور جہانعالم بھی استراحت فرماتے ہونگے۔ یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو اب کی دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اس اثناء میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علیشاہ معزول کر دیئے گئے تھے۔ اور فوج انھیں گرفتار کئے لئے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی

ہنگامہ نہ ہُوا۔ نہ کشت و خون۔ یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوتے۔ جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے بیگمیں روئیں۔ نواب روئے۔ ماماتیں مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ازل سے کسی ملک میں کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی کم ازکم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسا نہ تھی جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں لکھنؤ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا۔ اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ حضور عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔

میر۔ ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجیے شہ۔

مرزا۔ حضرت ذرا ٹھہریے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔ حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہونگے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گُل ہوگیا۔

میر۔ رویا ہی چاہیں۔ یہ عیش قید فرنگ میں کہاں میسر۔ یہ شہ۔

مرزا۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت ہے۔ بلائے آسمانی۔

میر۔ ہاں ہے ہی۔ پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے۔ بچ نہیں سکتے۔

مرزا۔ آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے۔ حضور جانِ عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدر داں نہ رہا۔ لکھنؤ ویران ہوگیا

میر: پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچایئے۔ پھر حضور پُرنور کا ماتم کیجئے۔ یہ کشت اور مات۔ لانا ہاتھ۔

نواب کو لئے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی۔ ہار کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا۔ آیئے نواب صاحب کی حالتِ زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کیلئے بے صبر ہو رہے تھے۔

۴

شام ہو گئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نمازِ مغرب ادا کرنے لگیں۔ پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا دو خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا جی متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی۔ کہ ساری بازی بگڑ جاتی۔ ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے۔ ٹھمریاں گاتے تھے چٹکیاں لیتے تھے۔ آوازے کستے تھے۔ ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے۔ گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فعلیاں سن سن کر جھنجلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے۔ آپ چال نہ تبدیل کیا کیجئے۔ یہ کیا چال چلے۔ اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجئے۔ جناب آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجئے۔ جب تک دل میں چال کا فیصلہ نہ ہو جائے۔ مہرہ کو ہاتھ

نہ لگایا کیجئے۔ حضرت آپ ایک ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں۔ اس کی مات سمجھی جاتے پھر آپ نے چال بدلی امہرہ وہیں رکھ دیجئے۔

میر صاحب کا فرزیں پٹا جاتا تھا۔ بولے میں نے چال چلی کب تھی۔

مرزا۔ آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے۔ کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجئے۔

میر۔ اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا۔

مرزا۔ آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوتیں۔ تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزیں پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر۔ دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔

مرزا۔ یہ بازی آپ کی مات ہو گئی۔

میر۔ میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا۔ تو آپ مہرے اس گھر میں رکھ دیجئے۔ جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر۔ وہاں کیوں رکھوں۔ نہیں رکھتا۔

مرزا۔ آپ کو رکھنا پڑیگا۔

میر۔ ہرگز نہیں۔

مرزا۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنی ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا۔ نہ وہ۔ تکرار

میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشا۔ ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے
مرزا جی نے فرمایا۔ اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا۔ تو آپ آئین اور قاعدے
سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کئے۔ آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست
شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔

میر۔ گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہونگے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گذر گئیں۔

مرزا۔ اجی جائیے! نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گری کرتے کرتے عمر گذر گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا۔ بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔

میر۔ زبان سنبھالئے۔ ورنہ بُرا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں کسی نے آنکھ دکھائی۔ اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈا رکھل گیا۔

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے۔ اِدھر یا اُدھر۔

میر۔ ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکال لیں۔ اُن دنوں ادنےٰ و اعلےٰ سبھی

کٹار، خنجر، پیش قبض، شمشیر بچہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے۔ مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری انہیں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لئے۔ سلطنت کے لئے۔ قوم کے لئے کیوں مریں۔ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ قوی تر ہو گئے تھے۔ دونوں نے پینترے بدلے۔ لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں۔ چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں خم کھا کر گر پڑے دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لئے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لئے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوتی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوتی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے۔ اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے۔ جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

عبرت

پنڈت چندر دھر نے ایک لوئر پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے۔ کہ ناحق اس جنجال میں آ پھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ یہاں تو مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی اِدھر آتے اُدھر غائب! نہ کھانے کا سکھ، نہ پہننے کا آرام۔ ان کے پڑوس میں دو آدمی اور رہتے تھے۔ ایک ٹھاکر اتی بل سنگھ ہیڈ کانسٹبل دوسرے منشی بیج ناتھ سیاہ نویس۔ ان دونوں آدمیوں کی تنخواہ منشی جی سے زیادہ نہ تھی تب بھی ان کی آرام سے کٹتی تھی۔ شام کو کچہری سے آتے۔ اپنے بچوں کے لئے مٹھائیاں لاتے۔ دونوں صاحبوں کے پاس خدمت گار تھے۔ گھر میں کرسیاں، میز، فرش سب ہی سامان موجود تھا۔ ٹھاکر صاحب شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر خوشبو دار تمباکو پیتے۔ منشی جی اپنے کمرہ میں بیٹھ کر شیشہ و ساغر سے شوق کرتے۔ جب کچھ سرور آتا تو ہارمونیم بجاتے۔ سارے محلہ میں ان کا رعب غالب تھا۔ انہیں آتے جاتے دیکھ کر بنئے اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ ان کے لئے بازار میں خاص نرخ تھے۔ آنے سیر کی چیز ٹکے سیر میں لاتے۔ لکڑی ایندھن مفت۔ شام سویرے اُن کے یہاں آدمیوں کا مجمع رہتا۔ پنڈت جی ان کے یہ ٹھاٹھ دیکھ کر کڑھتے اور اپنی تقدیر کو کوستے۔ علم و لیاقت میں وہ لوگ ان

کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ انہیں اتنا علم بھی نہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا آفتاب زمین کے گرد۔ تاہم وہ چین کرتے تھے۔ وہ لوگ کبھی کبھی ازراہ ترحم پنڈت جی کے ساتھ ہمسائگی کے حق ادا کیا کرتے۔ کبھی سیر آدھ سیر دودھ بھجوا دیتے۔ کبھی ترکاریاں۔ مگر اس کے عوض میں پنڈت جی کو ٹھاکر صاحب کے دو اور منشی جی کے تین اور لڑکوں کی نگرانی کرنا پڑتی۔ ٹھاکر صاحب فرماتے۔ پنڈت جی یہ لڑکے ہر دم کھیلا کرتے ہیں۔ ذرا ان کی تنبیہ کرتے رہئے۔ منشی جی کہتے۔ یہ لونڈے آوارہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا ان کی نگرانی کیا کیجئے۔ یہ فرمائشیں ایسی مربیانہ لہجہ میں کی جاتی تھیں گویا پنڈت جی ان کے زرخرید غلام ہیں۔ پنڈت جی دل کو مسوس کر رہ جاتے۔ مگر انہیں ناراض نہ کر سکتے تھے۔ انکی بدولت کبھی کبھی دودھ دہی کے درشن تو ہو جاتے تھے۔ محض اتنا ہی نہیں۔ انکی بدولت وہ بازار سے خاص نرخ پر جنس لاتے اسلئے بیچارے اس تحکم کو زہر کے گھونٹ کی طرح پیتے تھے۔ انہوں نے اس صیغہ سے نکلنے کے لئے کوئی بات اٹھا نہ رکھی تھی۔ درخواستیں دیں۔ افسروں کی خوشامدیں کیں۔ مگر مراد پوری نہ ہوتی۔ ہاں اتنا تھا کہ اس بددلی کا اثر اپنے منصبی کاموں پر نہ ہونے دیتے۔ تعلیم میں غفلت نہ کرتے، دل لگا کر پڑھاتے۔ اس سے ان کے افسر خوش ہوتے۔ سال میں کچھ انعام دیتے تھے۔ اور ترقی کا جب کبھی موقع ملتا۔ ان کا خاص خیال رکھتے۔ لیکن اس صیغہ کی ترقی اودسر کی کھیتی ہے بڑے بھاگ سے ہاتھ لگتی ہے۔ وہاں قصبہ کے لوگ ان سے خوش تھے اور مدرسہ کے لڑکے تو ان پر جان دیتے تھے۔ کوئی ان کے گھر آکر پانی بھر دیتا۔ کوئی ان کی بکری کے لئے پتیاں توڑ لاتا۔ پنڈت جی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔

۲

ایک بار ساون کے مہینہ میں منشی جی اور ٹھاکر صاحب نے اجودھیا کے جاترا کی صلاح کی۔ دُور کا سفر تھا۔ مع عیال کے جانا چاہتے تھے۔ دونوں اصحاب نے ایک ایک ہفتہ کی رخصت لی۔ اور پنڈت جی کو ساتھ لے چلنے پر مجبور کیا۔ یہ کچھ دُبدھے میں تھے۔ لیکن جب اُن لوگوں نے سفر خرچ کا ذمہ لیا۔ تب انکار کی گنجائش نہ رہی۔ اجودھیا کی جاترا کا ایسا اچھا موقع پا کر کیونکر رُکتے۔ بلھور سے ایک بجے رات کو گاڑی چھوٹتی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس لئے سرِ شام ہی سے اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں آج میلہ کے سبب سے بڑی بھیڑ تھی۔ جب گاڑی آئی تو دھکم دھکا شروع ہوا۔ کوئی آگے گیا۔ کوئی پیچھے۔ پنڈت جی اور ٹھاکر صاحب آگے نکل گئے۔ منشی جی پیچھے رہ گئے اس آفت میں کوہی کس کا راستہ دیکھتا ہے۔ الگ الگ گاڑیوں میں جا بیٹھے۔

جس کمرہ میں ٹھاکر صاحب اور پنڈت جی گھُسے۔ اس میں صرف چار آدمی تھے ان میں دو بیٹھے تھے۔ دو لیٹے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے ایک آدمی سے کرخت لہجہ میں کہا۔ اُٹھ بیٹھو جی۔ دیکھتے نہیں ہو۔ ہم لوگ کھڑے ہیں۔

مسافر۔ لیٹے لیٹے بولا۔ کیوں اُٹھ بیٹھیں جی۔ کچھ تمہارے بیٹھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ کیا ہم نے کرایہ نہیں دیا ہے۔

مسافر۔ جسے کرایہ دیا ہو اُس سے جا کر جگہ مانگو۔

ٹھاکر۔ ذرا ہوش سے باتیں کرو۔ اس ڈبے میں دس آدمیوں کے بیٹھنے کا

حکم ہے۔

مسافر: یہ تھانہ نہیں ہے۔ ذرا زبان سنبھال کر باتیں کیجئے۔

ٹھاکر نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ تم کون ہو؟

مسافر: ہم وہی ہیں جس پر آپ نے خفیہ فروشی کا الزام لگایا تھا۔ اور جس کے ڈرانے سے آپ پچیس روپیے لے کر ٹلے تھے۔

ٹھاکر: اہا اب پہچانا۔ مگر میں نے تو رعایت کی تھی۔ اگر چالان کر دیتا تو تم سزا پا جاتے۔

مسافر: میں نے بھی تو تمہارے ساتھ رعایت کی ہے۔ اگر دھکیل دیتا۔ تو تم گاڑی سے نیچے چلے جاتے۔

دوسرا لیٹا ہوا مسافر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ کیوں جناب دارو غہ جی آپ مجھے کیوں نہیں اٹھاتے؟

ٹھاکر صاحب غصہ سے لال ہو رہے تھے۔ مگر اسوقت بُرے پھنسے تھے حالانکہ وہ مضبوط آدمی تھے لیکن وہ دونوں بھی قوی ہیکل تھے۔ سختی سے کام نہ نکلتے دیکھکر ملائمت سے بولے تمہیں اُٹھ جاؤ۔ صندوق بنچ پر رکھا ہے۔ اسے نیچے رکھ دو بس جگہ ہو جاتی ہے۔

مسافر: اور آپ ہی کیوں نہ نیچے بیٹھ جائیں۔ اس میں کونسی مشخنت ماری جاتی ہے یہ تھانہ تھوڑا ہی ہے کہ آپ کے رُعب میں فرق آجائیگا۔

ٹھاکر: کیا تمہیں بھی مجھ سے کوئی عداوت ہے؟ میں نے تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی۔

مسافر: آپ نے میری صورت نہ دیکھی ہوگی لیکن آپ کے ڈنڈے نے دیکھی

ہے۔ اسی میلہ میں آپ نے مجھے کئی ڈنڈے رسید کئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ کانسٹبلوں کی ایک فوج تھی میں مار کھا کر ضبط کر گیا لیکن زخم ابھی دل پر تازہ ہے۔ اس کی دوا کی تلاش اسی دن سے کر رہا ہوں۔ بارے آج موقعہ ملا ہے۔ میں بھی ٹھاکر ہوں۔ آپ سے عزت میں حیثیت میں، خاندان میں ہیٹا نہیں۔ خاموش بیٹھ جایئے۔ ورنہ شاید میرے سر پر شیطان سوار ہو جائے۔

پنڈت جی اب تک خاموش کھڑے تھے۔ دل میں کانپ رہے تھے کہ کہیں مار پیٹ نہ ہو جاتے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے۔ موقع پا کر ٹھاکر صاحب کو سمجھایا۔ ٹھاکر نے طرح دینے ہی میں خیریت سمجھی۔ جوں ہی تیسرا اسٹیشن آیا۔ انہوں نے اس کمرہ سے بیوی بچوں کو نکالا۔ ان دونوں شیطانوں نے ان کے اسباب اٹھا اٹھا کر پھینک دیئے جب ٹھاکر صاحب گاڑی سے اترنے لگے۔ تو ایک نے انہیں ایسا دھکا دیا کہ بیچارے اوندھے منہ پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ گارڈ سے فریاد کرنے دوڑے تھے۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ جا کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

۳

ادھر منشی بیج ناتھ کی اس سے بھی بری حالت تھی۔ ساری رات جاگتے گذر گئی۔ ذرا پیر پھیلانے کی جگہ نہ تھی۔ جیب میں شراب کی بوتل رکھ لی تھی۔ ہر سٹیشن پر سٹیم تیز کر لیتے تھے۔ معمول سے زیادہ پی گئے۔ ایک تو شراب کا نشہ۔ اس پر جگہ کی تنگی۔ ہاضمہ میں فتور پڑ گیا۔ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ بیچارے بڑی مشکل میں پھنسے۔ کہیں ہلنے کی جگہ نہ تھی۔ اسہال کے آثار نظر آنے لگے۔ لکھنؤ تک تو انہوں نے کسی طرح ضبط کیا۔ مگر اور آگے چل کر یارا نہ رہا۔ ایک سٹیشن پر اتر پڑے۔ کھڑے نہ ہو سکتے تھے پلیٹ فارم

پر لیٹ گئے۔ بیوی بھی گھبرا کر اُتر پڑی کھینچ کھانچ کر اسباب اُتارا۔ جلدی میں ٹرنک اُتارنا بھول گئی۔ داروغہ جی نے منشی جی کو زمین پر لیٹے دیکھا۔ تو سمجھ گئے حضرت زیادتی کر گئے مروت نے اترنے پر مجبور کیا۔ سب نے یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ دیکھا تو منشی جی کی حالت ابتر تھی۔ بخار، تشنج، پیٹ میں مروڑ، قے اور دست۔ بڑی تشویش ہوئی۔ سٹیشن ماسٹر نے سمجھا ہیضہ ہو گیا ہے۔ حکم دیا مریض کو ابھی باہر لے جاؤ۔ داروغہ جی نے ہر چند منت سماجت کی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ مجبوراً لوگ منشی جی کو اسٹیشن کے احاطہ سے باہر ایک درخت کے نیچے لائے۔ منشیائن رونے لگیں۔ اب حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش ہوئی۔ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک شفا خانہ تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کام کمپونڈر سے لیا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے ملازموں سے معلوم ہؤا۔ کہ ڈاکٹر صاحب بھی بلہور ہی کے رہنے والے ہیں۔ لوگوں کو تسکین ہوئی۔ داروغہ جی شفا خانہ کی طرف دوڑے۔ کمپونڈر سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا آپ ذرا چل کر انھیں دیکھ لیجئے۔ ان کا نام تھا چوکھے لال کھائی سے بولے۔ صبح کے وقت باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ جی۔ تو کیا منشی جی کو یہیں لائیں؟

چوکھے لال۔ آپ کا جی چاہے لائیے۔

ٹھاکر صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے ایک ڈولی کا بندوبست کیا۔ منشی جی کو لاد کر شفا خانہ لائے۔ جوں ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ چوکھے لال نے ڈانٹ کر کہا۔ ڈولی نیچے رکھو۔ ہیضہ کے مریض کو اوپر لانے کا حکم نہیں ہے۔ بیج ناتھ بیہوش تو تھے نہیں۔ آواز سنی۔ پہچانا۔ ارے یہ تو چوکھے لال ہیں۔ کیوں بھئی مجھے پہچانتے ہو۔

چوکھے لال۔ جی ہاں۔ خوب پہچانتا ہوں۔

بیج ناتھ۔ پہچان کر بھی اتنی بے مروتی۔ میری جان نکل رہی ہے۔ دیکھئے تو مجھے کیا ہو گیا ہے؟

چوکھے لال۔ دیکھ لوں گا۔ میرا کام ہی کیا ہے فیس نکالئے۔

داروغہ جی غصّہ سے بولے۔ شفاخانہ میں کیسی فیس جناب من۔

چوکھے لال۔ ویسی ہی۔ جیسی ان منشی صاحب نے مجھ سے وصول کی تھی۔ جناب من۔

داروغہ۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ یہ غریب یہاں کیا کرنے آتے۔

چوکھے لال جی آپ نہیں سمجھے۔ میرا وطن بلھور ہے۔ وہاں میری تھوڑی سی زمین ہے۔ اس کا لگان داخل کرنے جب تحصیل میں جاتا ہوں۔ تو منشی جی ڈانٹ کر اپنا حق وصول کر لیتے ہیں۔ تو جناب کبھی ناؤ گاڑی پر کبھی گاڑی ناؤ پر۔ اس وقت میری باری ہے۔ میری فیس کے دس روپے نکالئے۔ ورنہ اپنی راہ لیجئے۔

داروغہ جی نے منشیائن سے روپے مانگے تب اسے اپنے بکس کی یاد آئی۔ چھاتی پیٹ لی۔ روپے سب اسی میں رکھے تھے۔ داروغہ جی بھی واجبی خرچ لے کر چلے تھے۔ کسی طرح دس روپے نکال چوکھے لال کی نذر کئے۔ انہوں نے دوا دی۔ دن بھر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مگر رات کو طبیعت کچھ سنبھلی۔ دوسرے دن پھر دوا کی ضرورت ہوئی۔ داروغہ جی نے بہت آرزو منت کی لیکن چوکھے لال نے ایک نہ سنی۔ آخر منشیائن کا ایک زیور جو چوبیس روپے سے کم کا نہ تھا۔ بازار میں بیچا گیا۔ تب چوکھے لال نے دوا دی۔ شام تک منشی جی چنگے ہو گئے۔

۴

اجودھیا میں پہنچ کر لوگ قیام گاہ کی تلاش کرنے لگے۔ پنڈوں کے یہاں مطلق جگہ نہ تھی۔ ساری بستی میں گھومے۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری۔ کہ کسی درخت کے نیچے ڈیرہ جمانا چاہیے۔ لیکن درختوں کے نیچے بھی جہاں جاتے تھے۔ جاتری لوگ پڑے ملتے تھے۔ مجبور ہو کر کھلے میدان میں ریتا پر بستر وغیرہ لگائے۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن لیٹنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ بادل گھر آئے۔ موسلادھار پانی برسنے لگا۔ بجلی کوندنے لگی۔ گرج سن کر لڑکے چیخنے لگے۔ عورتوں کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کسی جائے پناہ کی تلاش ہوئی۔ تینوں آدمی ادھر اُدھر مجبورانہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ تاریکی میں کچھ نہ سوجھتا تھا۔ پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق آئے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

دفعتہً ایک آدمی لالٹین لئے ندی کیطرف سے آتا نظر آیا۔ وہ قریب پہنچا۔ تو پنڈت جی اسکے پاس جاکر بولے۔ کیوں بھائی صاحب؟ یہاں کہیں مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے گی؟

وہ آدمی رُک گیا۔ غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر بولا۔ آپ پنڈت چندردھر تو نہیں ہیں۔

پنڈت جی خوش ہو کر بولے۔ جی ہاں۔ مگر آپ مجھے کیونکر جانتے ہیں؟

اس آدمی نے ادب سے پنڈت جی کے پیروں پر سر جھکایا۔ اور بولا میں آپ کا پرانا شاگرد ہوں۔ میرا نام کرپاشنکر ہے۔ میرے والد کچھ دنوں بلہور میں ڈاک منشی رہے تھے۔ انہیں دنوں میں آپ کی خدمت میں تھا۔

پنڈت جی کو بھی فوراً یاد آ گئی۔ بولے۔ او ہو تم کرپاشنکر۔ اُس وقت تو تم دُبلے پتلے لڑکے تھے۔ کوئی آٹھ نو سال ہوتے ہونگے؟

کرپاشنکر۔ جی ہاں نواں سال ہے۔ میں نے وہاں سے آکر انگریزی پڑھی۔ اب یہاں میونسپلٹی میں نوکر ہوں۔ کہئے آپ تو اچھی طرح رہے۔ بڑی خوش نصیبی ہے آپ کے درشن ہو گئے۔ کیا آپ کے بال بچے ساتھ ہیں؟

پنڈت جی۔ نہیں میں تو اکیلا ہی ہوں لیکن میرے ساتھ داروغہ جی اور سیاہ نویس صاحب بھی بال بچوں کے ساتھ ہیں۔

کرپاشنکر۔ کل کتنے آدمی ہونگے؟

پنڈت جی۔ دس آدمی ہیں مگر تھوڑی سی جگہ مل جاتے تو گذر کریں گے۔

کرپاشنکر۔ نہیں جناب۔ بہت سی جگہ لیجئے۔ میرا بڑا سا مکان خالی پڑا ہے۔ چلئے آرام سے رہئے۔ یہ تو میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ چھتریاں تو کافی ہیں نہ؟ چلئے میرے ساتھ۔

لوگ پانی میں لت پت چھتریاں لگاتے۔ بستر سروں پہ اٹھاتے چلے کرپاشنکر کا مکان قریب تھا۔ وسیع، صاف ستھرا۔ اُس نے جاتے ہی آگ جلوا دی۔ پلنگ بچھوا دیتے لوگ آرام سے بیٹھے گھر میں پوریاں پکنے لگیں۔ کرپاشنکر ہاتھ باندھے ہوئے چاکروں کی طرح پنڈت جی کے ذرا ذرا سے اشارے پر دوڑتا تھا۔ ایک گھنٹہ میں کھانا تیار ہو گیا۔ کھا پی کر لوگ لیٹے خدا کا شکر کر رہے تھے کہ کرپاشنکر مل گیا۔ ورنہ آج جان بچنی مشکل تھی۔

۵

اور سب لوگ تو نیند میں غافل ہو گئے۔ مگر پنڈت چندر دھر کو نیند نہیں آئی۔ اس

سفر کے واقعات کا ایک نقشہ ان کے سامنے کھچا ہوا تھا۔ اور قوت امتیاز ان کا موازنہ کر رہی تھی۔ گاڑی کی رگڑ جھگڑا اور شفاخانہ کی نوچ کھسوٹ کے مقابلہ میں کرپا شنکر کی شرافت اور مہمان نوازی کا دل پر خاص اثر ہو رہا تھا۔ وہ آج اپنے پیشہ کی عظمت کو سمجھے۔ آج اس کی اہمیت کے قائل ہوئے۔

یہ لوگ تین دن اجودھیا میں رہے۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوئی۔ کرپا شنکر نے خاطر و مدارات میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ تیسرے دن یہ لوگ چلنے لگے تو وہ اسٹیشن تک پہنچانے آیا۔ جب گاڑی نے سیٹی دی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوتے اور کہا کبھی کبھی مجھے یاد کیا کیجئے گا۔

پنڈت جی گھر پہنچے تو ان کے مزاج میں تغیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے پھر کسی دوسرے صیغہ میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ پھر اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔

عبرت

پنڈت چندردھر نے ایک لوئر پرائمری مدرسہ کی مدرسی کر تو لی تھی۔ مگر ہمیشہ پچھتایا کرتے۔ کہ ناحق اس جنجال میں آپھنسے۔ اگر کسی اور صیغہ میں ہوتے تو اب تک ہاتھ میں چار پیسے ہوتے۔ آرام سے زندگی بسر ہوتی۔ یہاں تو مہینہ بھر کے انتظار کے بعد کہیں پندرہ روپے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بھی اِدھر آتے اُدھر غائب! نہ کھانے کا سکھ، نہ پہننے کا آرام۔ ان کے پڑوس میں دو آدمی اور رہتے تھے۔ ایک ٹھاکر اتی بل سنگھ ہیڈ کانسٹیبل دوسرے منشی بیج ناتھ سیاہ نویس۔ ان دونوں آدمیوں کی تنخواہ منشی جی سے زیادہ نہ تھی تب بھی ان کی آرام سے کٹتی تھی۔ شام کو کچہری سے آتے۔ اپنے بچوں کے لئے مٹھائیاں لاتے۔ دونوں صاحبوں کے پاس خدمت گار تھے۔ گھر میں کرسیاں میز فرش سب ہی سامان موجود تھا۔ ٹھاکر صاحب شام کو آرام کرسی پر لیٹ کر خوشبودار تمباکو پیتے۔ منشی جی اپنے کمرہ میں بیٹھ کر شیشہ و ساغر سے شوق کرتے جب کچھ سرور آتا تو ہارمونیم بجاتے۔ سارے محلہ میں ان کا رعب غالب تھا۔ انہیں آتے جاتے دیکھ کر بنئے اُٹھ اُٹھ کر سلام کرتے۔ ان کے لئے بازار میں خاص نرخ تھے۔ آنے سیر کی چیز ٹکے سیر میں لاتے۔ لکڑی ایندھن مفت۔ شام سویرے اُن کے یہاں آدمیوں کا مجمع رہتا۔ پنڈت جی ان کے یہ ٹھاٹھ دیکھ کر کڑھتے اور اپنی تقدیر کو کوستے۔ علم ولیاقت میں وہ لوگ ان

کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ انہیں اتنا علم بھی نہ تھا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا آفتاب زمین کے گرد۔ تاہم وہ چین کرتے تھے۔ وہ لوگ کبھی کبھی ازراہ ترحم پنڈت جی کے ساتھ ہمسائگی کے حق ادا کیا کرتے۔ کبھی سیر آدھ سیر دودھ بھجوا دیتے۔ کبھی ترکاریاں۔ مگر اس کے عوض میں پنڈت جی کو ٹھاکر صاحب کے دو اور منشی جی کے تین اور لڑکوں کی نگرانی کرنا پڑتی۔ ٹھاکر صاحب فرماتے۔ پنڈت جی۔ یہ لڑکے ہر دم کھیلا کرتے ہیں۔ ذرا ان کی تنبیہ کرتے رہیے۔ منشی جی کہتے۔ یہ لونڈے آوارہ ہوئے جاتے ہیں۔ ذرا ان کی نگرانی کیا کیجئے۔ یہ فرمائشیں ایسی مربیانہ لہجہ میں کی جاتی تھیں گویا پنڈت جی ان کے زرخرید غلام ہیں۔ پنڈت جی دل کو مسوس کر رہ جاتے۔ مگر انہیں ناراض نہ کر سکتے تھے۔ انکی بدولت کبھی کبھی دودھ دہی کے درشن تو ہو جاتے تھے محض اتنا ہی نہیں۔ انکی بدولت وہ بازار سے خاص نرخ پر جنس لاتے اسلئے بیچارے ان کے حکم کو زہر کے گھونٹ کی طرح پیتے تھے۔ انہوں نے اس صیغہ سے نکلنے کے لئے کوئی بات اٹھا نہ رکھی تھی۔ درخواستیں دیں۔ افسروں کی خوشامدیں کیں۔ مگر مراد پوری نہ ہوئی۔ ہاں اتنا تھا کہ اس بددلی کا اثر اپنے منصبی کاموں پر نہ ہونے دیتے۔ تعلیم میں غفلت نہ کرتے، دل لگا کر پڑھاتے۔ اس سے ان کے افسر خوش ہوتے۔ سال میں کچھ انعام دیتے تھے۔ اور ترقی کا جب کبھی موقع ملتا۔ ان کا خاص خیال رکھتے۔ لیکن اس صیغہ کی ترقی ادسر کی کھیتی ہے بڑے بھاگ سے ہاتھ لگتی ہے۔ وہاں قصبہ کے لوگ اُن سے خوش تھے اور مدرسہ کے لڑکے تو ان پر جان دیتے تھے۔ کوئی ان کے گھر آکر پانی بھر دیتا۔ کوئی ان کی بکری کے لئے پتیاں توڑ لاتا۔ پنڈت جی اسی کو غنیمت سمجھتے تھے۔

۲

ایک بار ساون کے مہینہ میں منشی جی اور ٹھاکر صاحب نے اجودھیا کے جاترا کی صلاح کی۔ دُور کا سفر تھا۔ مع عیال کے جانا چاہتے تھے۔ دونوں اصحاب نے ایک ایک ہفتہ کی رخصت لی۔ اور پنڈت جی کو ساتھ لے چلنے پر مجبور کیا۔ یہ کچھ دُبدھے میں تھے۔ لیکن جب اُن لوگوں نے سفر خرچ کا ذمہ لیا۔ تب انکار کی گنجائش نہ رہی۔ اجودھیا کی جاترا کا ایسا اچھا موقع پا کر کیونکر رُکتے۔ بلھور سے ایک بجے رات کو گاڑی چھوٹتی تھی۔ آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس لئے سرِ شام ہی سے اسٹیشن پر آ گئے۔ یہاں آج میلہ کے سبب سے بڑی بھیڑ تھی۔ جب گاڑی آئی تو دھکم دھکا شروع ہوا۔ کوئی آگے گیا۔ کوئی پیچھے۔ پنڈت جی اور ٹھاکر صاحب آگے نکل گئے۔ منشی جی پیچھے رہ گئے اس آفت میں کو ہی کس کا راستہ دیکھتا ہے۔ الگ الگ گاڑیوں میں جا بیٹھے۔

جس کمرہ میں ٹھاکر صاحب اور پنڈت جی گھُسے۔ اسمیں صرف چار پانچ آدمی تھے ان میں دو بیٹھے تھے۔ دو لیٹے ہوئے تھے۔ ٹھاکر صاحب نے ایک آدمی سے کرخت لہجہ میں کہا۔ اُٹھ بیٹھو جی۔ دیکھتے نہیں ہو۔ ہم لوگ کھڑے ہیں۔

مسافر۔ لیٹے لیٹے بولا۔ کیوں اُٹھ بیٹھیں جی۔ کچھ تمہارے بیٹھنے کا ٹھیکہ لیا ہے۔

ٹھاکر صاحب۔ کیا ہم نے کرایہ نہیں دیا ہے۔

مسافر۔ جسے کرایہ دیا ہو اُس سے جا کر جگہ مانگو۔

ٹھاکر۔ ذرا ہوش سے باتیں کرو۔ اس ڈبے میں دس آدمیوں کے بیٹھنے کا

حکم ہے۔

مسافر: یہ تھانہ نہیں ہے۔ ذرا زبان سنبھال کر باتیں کیجئے۔

ٹھاکر نے غور سے دیکھ کر پوچھا۔ تم کون ہو؟

مسافر: ہم وہی ہیں جن پر آپ نے خفیہ فروشی کا الزام لگایا تھا۔ اور جس کے ڈرانے سے آپ پچیس روپے لے کر ٹلے تھے۔

ٹھاکر: آہا اب پہچانا۔ مگر میں نے تو رعایت کی تھی۔ اگر چالان کر دیتا تو تم سزایاب ہو جاتے۔

مسافر: میں نے بھی تو تمہارے ساتھ رعایت کی ہے۔ اگر دھکیل دیتا۔ تو تم گاڑی سے نیچے چلے جاتے۔

دوسرا لیٹا ہوا مسافر زور سے قہقہہ مار کر ہنسا اور بولا۔ کیوں جناب داروغہ جی! مجھے کیوں نہیں اٹھاتے؟

ٹھاکر صاحب غصہ سے لال ہو رہے تھے۔ مگر افسوس بُرے پھنسے تھے حالانکہ وہ مضبوط آدمی تھے لیکن وہ دونوں بھی قوی ہیکل تھے۔ سختی سے کام نہ نکلتے دیکھ کر ملائمت سے بولے تمہیں اُٹھ جاؤ۔ صندوق بنچ پر رکھتا ہے۔ اسے نیچے رکھ دو بس جگہ ہو جاتی ہے۔

مسافر: اور آپ ہی کیوں نہ نیچے بیٹھ جائیں۔ اس میں کونسی مشیخت ماری جاتی ہے یہ تھانہ تھوڑا ہے کہ آپ کے رُعب میں فرق آ جائیگا۔

ٹھاکر: کیا تمہیں بھی مجھ سے کوئی عداوت ہے؟ میں نے تو تمہاری صورت بھی نہیں دیکھی۔

مسافر: آپ نے میری صورت نہ دیکھی ہوگی لیکن آپ کے ڈنڈے نے دیکھی

ہے۔ اسی میلہ میں آپ نے مجھے کئی ڈنڈے رسید کئے۔ اس وقت آپ کے ساتھ کانسٹبلوں کی ایک فوج تھی۔ میں مار کھا کر ضبط کر گیا۔ لیکن زخم ابھی دل پر تازہ ہے۔ اس کی دوا کی تلاش اسی دن سے کر رہا ہوں۔ بارے آج موقعہ ملا ہے۔ میں بھی ٹھاکر ہوں۔ آپ سے عزت میں حیثیت میں، خاندان میں ہیٹا نہیں۔ خاموش بیٹھ جایئے۔ ورنہ شاید میرے سر پر شیطان سوار ہو جائے۔

پنڈت جی اب تک خاموش کھڑے تھے۔ دل میں کانپ رہے تھے کہ کہیں مار پیٹ نہ ہو جائے تو گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جائے۔ موقع پا کر ٹھاکر صاحب کو سمجھایا۔ ٹھاکر نے طرح دینے ہی میں خیریت سمجھی۔ جوں ہی تیسرا اسٹیشن آیا۔ انہوں نے اس کمرہ سے بیوی بچوں کو نکالا۔ ان دونوں شیطانوں نے ان کے اسباب اٹھا اٹھا کر پھینک دیئے جب ٹھاکر صاحب گاڑی سے اترنے لگے۔ تو ایک نے انہیں ایسا دھکا دیا کہ بیچارے اوندھے منہ پلیٹ فارم پر گر پڑے۔ گارڈ سے فریاد کرنے دوڑے تھے۔ اتنے میں انجن نے سیٹی دی۔ جا کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

۳

ادھر منشی بیج ناتھ کی اس سے بھی بری حالت تھی۔ ساری رات جاگتے گذر گئی۔ ذرا پیر پھیلانے کی جگہ نہ تھی۔ جیب میں شراب کی بوتل رکھ لی تھی۔ ہر سٹیشن پر سٹیم تیز کر لیتے تھے۔ معمول سے زیادہ پی گئے۔ ایک تو شراب کا نشہ۔ اس پر جگہ کی تنگی۔ ہاضمہ میں فتور پڑ گیا۔ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ بیچارے بڑی مشکل میں پھنسے۔ کہیں ہلنے کی جگہ نہ تھی۔ اسہال کے آثار نظر آنے لگے۔ لکھنؤ تک تو انہوں نے کسی طرح ضبط کیا۔ مگر اور آگے چل کر یار آتے ضبط نہ رہا۔ ایک سٹیشن پر اتر پڑے۔ کھڑے نہ ہو سکتے تھے پلیٹ فارم

پر لیٹ گئے۔ بیوی بھی گھبرا کر اُتر پڑی۔ کھینچ کھانچ کر اسباب اُتارا۔ جلدی میں ٹرنک اُتارنا بھول گئی۔ داروغہ جی نے منشی جی کو زمین پر لیٹے دیکھا۔ تو سمجھ گئے حضرت زیادتی کر گئے مروت نے اترنے پر مجبور کیا۔ سب نے یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ دیکھا تو منشی جی کی حالت ابتر تھی۔ بخار۔ تشنج۔ پیٹ میں مروڑ، قے اور دست۔ بڑی تشویش ہوئی۔ سٹیشن ماسٹر نے سمجھا ہیضہ ہو گیا ہے۔ حکم دیا مریض کو ابھی باہر لے جاؤ۔ داروغہ جی نے ہر چند منت سماجت کی۔ مگر انھوں نے ایک نہ سنی۔ مجبوراً لوگ منشی جی کو اسٹیشن کے احاطہ سے باہر ایک درخت کے نیچے لائے۔ منشیائن رونے لگیں۔ اب حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی تلاش ہوئی۔ وہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک شفا خانہ تھا۔ مگر ڈاکٹر کا کام کمپونڈر سے لیا جاتا تھا۔ اسٹیشن کے ملازموں سے معلوم ہوا۔ کہ ڈاکٹر صاحب بھی بلھور ہی کے رہنے والے ہیں۔ لوگوں کو تسکین ہوئی۔ داروغہ جی شفا خانہ کی طرف دوڑے۔ کمپونڈر سے ساری کیفیت بیان کی اور کہا آپ ذرا چل کر انھیں دیکھ لیجئے۔ ان کا نام تھا چوکھے لال کھائی سے بولے۔ صبح کے وقت باہر جانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ جی۔ تو کیا منشی جی کو یہیں لائیں؟

چوکھے لال۔ آپ کا جی چاہے لائیے۔

ٹھاکر صاحب نے دوڑ دھوپ کر کے ایک ڈولی کا بندوبست کیا۔ منشی جی کو لا کر شفا خانہ لائے۔ جوں ہی برآمدے میں قدم رکھا۔ چوکھے لال نے ڈانٹ کر کہا۔ ڈولی نیچے رکھو۔ ہیضہ کے مریض کو اوپر لانے کا حکم نہیں ہے۔ بزنج ناتھ بیہوش تو تھے نہیں۔ آواز سنی۔ پہچانا۔ ارے یہ تو چوکھے لال ہیں۔ کیوں بھئی مجھے پہچانتے ہو۔

چوکھے لال۔ جی ہاں۔ خوب پہچانتا ہوں۔

بیج ناتھ۔ پہچان کر بھی اتنی بے مروتی۔ میری جان نکل رہی ہے۔ دیکھئے تو مجھے کیا ہو گیا ہے؟

چوکھے لال۔ دیکھ لوں گا۔ میرا کام ہی کیا ہے فیس نکالئے۔

داروغہ جی غصہ سے بولے۔ شفاخانہ میں کیسی فیس جناب من۔

چوکھے لال۔ ویسی ہی۔ جیسی ان منشی صاحب نے مجھ سے وصول کی تھی۔ جناب من۔

داروغہ۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟ یہ غریب یہاں کیا کرنے آتے۔

چوکھے لال۔ جی آپ نہیں سمجھے۔ میرا وطن بلہور ہے۔ وہاں میری تھوڑی سی زمین ہے۔ اس کا لگان داخل کرنے جب تحصیل میں جاتا ہوں۔ تو منشی جی ڈانٹ کر اپنا حق وصول کر لیتے ہیں۔ تو جناب کبھی ناؤ گاڑی پر، کبھی گاڑی ناؤ پر۔ اس وقت میری باری ہے۔ میری فیس کے دس روپے نکالئے۔ ورنہ اپنی راہ لیجئے۔

داروغہ جی نے منشیاتن سے روپے مانگے۔ تب اسے اپنے بکس کی یاد آئی۔ چھاتی پیٹ لی۔ روپے سب اسی میں رکھے تھے۔ داروغہ جی بھی واجبی خرچ لے کر چلے تھے۔ کسی طرح دس روپے نکال چوکھے لال کی نذر کئے۔ انہوں نے دوا دی۔ دن بھر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ مگر رات کو طبیعت کچھ سنبھلی۔ دوسرے دن پھر دوا کی ضرورت ہوئی۔ داروغہ جی نے بہت آرزو منت کی لیکن چوکھے لال نے ایک نہ سنی۔ آخر منشیاتن کا ایک زیور جو چوبیس روپے سے کم کا نہ تھا۔ بازار میں بیچا گیا۔ تب چوکھے لال نے دوا دی۔ شام تک منشی جی چنگے ہو گئے۔

۹

اجودھیا میں پہنچ کر لوگ قیام گاہ کی تلاش کرنے لگے۔ پنڈوں کے یہاں مطلق جگہ نہ تھی۔ ساری بستی میں گھومے۔ مگر کہیں جگہ نہ ملی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری۔ کہ کسی درخت کے نیچے ڈیرہ جمانا چاہیے۔ لیکن درختوں کے نیچے بھی جہاں جاتے تھے۔ جاتری لدے پڑے ملتے تھے۔ مجبور ہو کر کھلے میدان میں ریتا پر بستر وغیرہ لگائے۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن لیٹنے بھی نہ پائے تھے۔ کہ بادل گھر آئے۔ موسلا دھار پانی برسنے لگا۔ بجلی کوندنے لگی۔ گرج سن کر لڑکے چیخنے لگے۔ عورتوں کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کسی جائے پناہ کی تلاش ہوئی۔ تینوں آدمی اِدھر اُدھر مجبور نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ تاریکی میں کچھ نہ سوجھتا تھا۔ پچھتا رہے تھے۔ کہ ناحق آئے۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔

دفعتہً ایک آدمی لالٹین لئے ندی کیطرف سے آتا نظر آیا۔ وہ قریب پہنچا۔ تو پنڈت جی اسکے پاس جاکر بولے۔ کیوں بھائی صاحب؟ یہاں کہیں مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ نہ ملے گی؟

وہ آدمی رُک گیا۔ غور سے پنڈت جی کی طرف دیکھ کر بولا۔ آپ پنڈت چندر دھر تو نہیں ہیں۔

پنڈت جی خوش ہوکر بولے۔ جی ہاں۔ مگر آپ مجھے کیونکر جانتے ہیں؟

اس آدمی نے ادب سے پنڈت جی کے پیروں پر سر جھکایا۔ اور بولا میں آپ کا پرانا شاگرد ہوں۔ میرا نام کرپا شنکر ہے۔ میرے والد کچھ دنوں بلہور میں ڈاک منشی رہے تھے۔ انہیں دنوں میں آپ کی خدمت میں تھا۔

پنڈت جی کو بھی فوراً یاد آ گئی۔ بولے۔ او ہو! تم کرپا شنکر۔ اُس وقت تو تم دُبلے پتلے لڑکے تھے۔ کوئی آٹھ نو سال ہوتے ہونگے؟

کرپا شنکر۔ جی ہاں نواں سال ہے۔ میں نے وہاں سے آ کر انگریزی پڑھی۔ اب یہاں میونسپلٹی میں نوکر ہوں۔ کہئے آپ تو اچھی طرح رہے۔ بڑی خوش نصیبی ہے آپ کے درشن ہو گئے۔ کیا آپ کے بال بچے ساتھ ہیں؟

پنڈت جی۔ نہیں میں تو اکیلا ہی ہوں لیکن میرے ساتھ داروغہ جی اور سیاہ نویس صاحب بھی بال بچوں کے ساتھ ہیں۔

کرپا شنکر۔ کل کتنے آدمی ہونگے؟

پنڈت جی۔ دس آدمی ہیں۔ مگر تھوڑی سی جگہ مل جاتے تو گذر کر لیں گے۔

کرپا شنکر۔ نہیں جناب۔ بہت سی جگہ لیجئے۔ میرا بڑا سا مکان خالی پڑا ہے۔ چلئے آرام سے رہئے۔ یہ تو میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ چھتریاں تو کافی ہیں نہ؟ چلئے میرے ساتھ۔

لوگ پانی میں لت پت چھتریاں لگاتے۔ بستر سروں پہ اٹھاتے چلے کرپا شنکر کا مکان قریب تھا۔ وسیع، صاف ستھرا۔ اُس نے جاتے ہی آگ جلوا دی۔ پلنگ بچھوا دیئے لوگ آرام سے بیٹھے گھر میں پوریاں پکنے لگیں۔ کرپا شنکر ہاتھ باندھے ہوئے چاکروں کی طرح پنڈت جی کے ذرا ذرا سے اشارے پر دوڑتا تھا۔ ایک گھنٹہ میں کھانا تیار ہو گیا۔ کھا پی کر لوگ لیٹے خدا کا شکر کر رہے تھے کہ کرپا شنکر مل گیا۔ ورنہ آج جان بچنی مشکل تھی۔

۵

اور سب لوگ تو نیند میں غافل ہو گئے۔ مگر پنڈت چندر دھر کو نیند نہیں آئی۔ اس

سفر کے واقعات کا ایک نقشہ ان کے سامنے کھچا ہُوا تھا۔ اور قوت امتیاز ان کا موازنہ کر رہی تھی۔ گاڑی کی رگڑ جھگڑ اور شفاخانہ کی نوچ کھسوٹ کے مقابلہ میں کرپا شنکر کی شرافت اور مہمان نوازی کا دل پہ خاص اثر ہو رہا تھا۔ وہ آج اپنے پیشہ کی عظمت کو سمجھے۔ آج اس کی اہمیت کے قائل ہوئے۔

یہ لوگ تین دن اجودھیا میں رہے۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوئی۔ کرپا شنکر نے خاطر و مدارات میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی۔ تیسرے دن یہ لوگ چلنے لگے تو وہ اسٹیشن تک پہنچانے آیا۔ جب گاڑی نے سیٹی دی تو اس نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے پنڈت جی کے قدم چھوئے اور کہا کبھی کبھی مجھے یاد کیا کیجئے گا۔

پنڈت جی گھر پہنچے تو ان کے مزاج میں تغیر ہو گیا تھا۔ انہوں نے پھر کسی دوسرے صیغہ میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ اور نہ پھر اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔

شکست کی فتح

کیشو میرا پرانا رقیب تھا۔ تحریر اور تقریر، مجلس اور محفل۔ غرض زندگی کے ہر ایک شعبہ میں وہ مجھ سے پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے مہرِ درخشاں کے سامنے میرے ستارے کو وہ فروغ کبھی نہ نصیب ہوا جس کا میں اپنے تئیں مستحق سمجھتا تھا۔ اُسے ایک بار زک دینا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ مگر بہت سعی و عمل کے باوجود بھی پوری نہ ہوئی۔ اس زمانہ میں مَیں نے کبھی اعتراف نہ کیا لیکن فی الواقعہ میں اس کی سی فطری ذہانت سے بے بہرہ تھا۔ اگر مجھے تسکین تھی تو یہ کہ میدان علم میں چاہے مجھے اس پر سبقت پانا کبھی نصیب نہ ہو لیکن دائرۂ عمل میں میری ہی فتح کا نقارہ بجیگا۔ لیکن جب بد قسمتی سے بحرِ الفت میں بھی اس نے میرے ہی ساتھ غوطہ مارا۔ اور موتی اس کے ہاتھ لگتا ہوا معلوم ہوا۔ تو میں مایوس ہو گیا۔ ہمارے پروفیسر بابو ہری داس بھاٹیہ خواہ اصول کے لحاظ سے دولت کے قائل نہ ہوں۔ مگر دولت سے بے نیاز نہ تھے۔ اپنی لجیاوتی کے لئے انہوں نے روشن طبع کیشو کو نہیں۔ مجھے منتخب کیا۔

ایک دن شام کو وہ میرے کمرے میں آئے اور متفکرانہ لہجہ میں بولے۔ شاردا چرن مجھے مہینوں سے ایک فکر دامنگیر ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم اُسے دُور کر سکتے ہو۔ میرے کوئی لڑکا نہیں ہے میں نے تمہیں اور کیشو دونوں ہی کو بیٹوں کی طرح سمجھا ہے

اگرچہ وہ تم سے زیادہ ذہین اور ذکی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ دُنیا میں جو کامیابی تمہیں
حاصل ہوگی وہ اسے نہیں ہو سکتی ہے۔ میں نے تمہیں اپنی لجیا وتی کے لئے تجویز کیا ہے۔ کیا
امید کروں کہ تم اُسے قبول کرو گے؟

میں آزاد تھا۔ میرے والدین مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تھے۔ میرے
خاندان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کی رضامندی کی مجھے فکر ہوتی۔ لجیا وتی جیسی حسینہ
ہنس مکھ اور محبت شعار بیوی پا کر ایسا کون شخص تھا جو اپنی قسمت کو نہ سراہتا۔ میں پھولا
نہ سمایا۔ لجیا وتی ایک شگفتہ باغ تھی جہاں گلاب کی دلآویز مہک تھی اور سبزہ کی روح
پرور طراوت نسیم کی مستانہ لہریں تھیں۔ اور چڑیوں کے پیارے چہچہے۔ وہ خود بھی مساوات
کے اصول کی دلدادہ تھی۔ عورتوں کے حق نیابت اور ایسے ہی دیگر مسائل پر اس نے
بارہا گفتگو کی تھی لیکن پروفیسر بھاٹیہ کی طرح محض اصولوں کی قائل نہ تھی۔ اس پر عمل
بھی کرنا چاہتی تھی۔ روشن طبع کیشو اس کا منشا در نظر تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ پروفیسر
بھاٹیہ کی مرضی اس کے لئے قانون ہے لیکن میرے لئے اس کی مرضی مقدم تھی۔ میں
اس معاملہ میں کامل آزادی کا قائل تھا۔ اس لئے میں کیشو کی دلگیری اور مایوسی سے وہ لطف
نہ اٹھا سکا جس کی مجھے تمنا تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے غم میں ڈوبے ہوئے تھے۔
اور مجھے پہلی بار کیشو سے ہمدردی ہوئی۔ میں لجیا وتی سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ
اس نے کیوں مجھے نظروں سے گرا دیا۔ پر اس کے روبرو ایسے نازک مسئلہ کو چھیڑتے
ہوتے مجھے تامل ہوتا تھا۔ اور یہ ایک قدرتی امر تھا۔ کیونکہ کوئی حسینہ ایسی حالت میں اپنے
دل کی باتیں کہنا پسند نہیں کر سکتی لیکن لجیا وتی اپنی باطنی کیفیات کو مجھ پر ظاہر کرنا اپنا
فرض سمجھ رہی تھی۔ وہ اس موقعہ کی تلاش کر رہی تھی جسے حسنِ اتفاق سے موقعہ بھی جلد

مل گیا۔

شام کا وقت تھا۔ کیشو راجپوت ہوسٹل میں اقتصادیات پر ایک مضمون پڑھنے گیا ہوا تھا۔ پروفیسر صاحب بھاٹیہ اس جلسہ کے صدر تھے۔ لجیا اپنے بنگلہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اپنے سوز باطن کو چھپاتے باشِ دغم حسد کی آگ سے جلتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ لجیا نے میری طرف ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ہمدردانہ انداز سے بولی۔ کچھ اداس نظر آتے ہو۔

میں نے مصنوعی بے پروائی سے کہا۔ تمہاری بلا سے۔

لجیا۔ کیشو کی تقریر سُننے نہیں گئے۔

میری آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ضبط کر کے بولا۔ کچھ طبیعت ناساز تھی۔

یہ کہتے کہتے میری آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑے۔ میں آنسوؤں سے اس کے درد کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رونا میرے خیال میں عورتوں ہی کے لئے مخصوص تھا۔ میں اس پر اپنا غصہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ اور نکل پڑے آنسو۔ جذبات کبھی ارادہ کے مطیع نہیں ہوتے۔

اب تک شاید لجیا دتی میرے خلوص الفت کا اندازہ نہ کر سکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ میں کینہ پرور نہیں ہوں۔ میں نے کبھی دل میں کدورت نہیں رکھی۔ مگر معلوم نہیں۔ کیوں مجھے لجیا کے رونے پر اس وقت گونہ مسرت ہوئی۔ اس حالت میں بھی نیش زنی سے باز نہ رہ سکا۔ بولا۔ لجیا۔ میں تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوں۔ غالباً تمہارے ستم کی فریاد کر رہا ہوں لیکن یہ تمہارے آنسو کیوں نکل رہے ہیں؟

لجیا نے میری طرف شکوہ کے انداز سے دیکھا۔ اور بولی۔ میرے آنسوؤں کا راز

تم نہ سمجھو گے۔ کیونکہ تم نے سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ تم مجھے طعنے دے کر اپنے دل کو تسکین دیتے ہو۔ میں کیسے جلاؤں؟ تمہیں کیا معلوم ہے کہ میں دل پر کتنا جبر کر کے، کتنا صبر کر کے کتنی راتیں کروٹیں بدل کر اور رو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ تمہارا اونچا گھرانہ۔ تمہاری ریاست۔ تمہاری ثروت ایک دیوار کی طرح میرے راستہ میں حائل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت تمہیں اپنے خاندان اور ریاست کا مطلق خیال نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے کالج کی ٹھنڈی چھاؤں میں پلے ہوئے خیالات زیادہ عرصہ تک زندگی کے گرم اور تند جھونکے نہ برداشت کر سکیں گے۔ اسوقت شاید تم اپنے فیصلہ پر پچھتاؤ اور کڑھو۔ میں تمہارے دودھ کی مکھی اور دل کا کانٹا نہیں بننا چاہتی۔

میں نے نرم ہو کر کہا جن اثروں سے میرے خیالات فنا ہو جائینگے۔ کیا وہ تمہارے خیالات باقی رکھیں گے؟

لجیاوتی۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ مجھ پر ان کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ میرے خاندان میں کبھی ریاست نہیں رہی۔ بابوجی نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کر کے یہ درجہ حاصل کیا۔ مجھے امارت اور ریاست کا غرور کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اُسی طرح جیسے تم اس غرور کو کبھی دل سے مٹا نہیں سکتے۔ یہ غرور مجھے اس وقت ہوگا جب اپنے کو بھول جاؤنگی۔

میں نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ خاندانی وقار کو تو میں مٹا نہیں سکتا میرے امکان سے باہر ہے لیکن ریاست سے تمہارے لئے آج دست بردار ہو سکتا ہوں اُسے کسی کار خیر کے لئے وقف کر کے ہم تم اپنی محنت کی کمائی کھا کر آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

بجیاوتی نے بیرحمانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ پھر وہی جذبہ پرستی۔ ایسے اہم معاملہ میں جس پر دو زندگیوں کا دارومدار ہے۔ میں محض جذبات کو اپنا رہنما نہیں بنا سکتی۔ شاردا انفنیع نہیں ہے۔ دھرم سے کہتی ہوں۔ مجھے ابھی تک خود نہیں معلوم کہ میری ناؤ کدھر جائے گی لیکن حالات سے مجبور ہوں۔ میں تمہاری زندگی کو تلخ نہیں کرنا چاہتی۔

میں یہاں سے چلا تو اتنا مایوس نہ تھا۔ جتنا فکرمند۔ بجیاوتی نے میرے سامنے ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا تھا۔

۲

ہم دونوں ایک ہی ساتھ ایم۔اے ہوئے کیشو درجۂ اوّل میں آیا۔ میں درجہ دوم میں۔ اُسے ناگپور کے ایک کالج میں پروفیسری مل گئی۔ میں گھر آکر اپنے علاقے کا انصرام کرنے لگا۔ چلتے وقت ہم دونوں گلے مل کر بادلِ پُر درد رخصت ہوئے۔ رقابت کالج کے اندر چھوڑ دی۔ اب ہمارے راستے الگ الگ تھے۔ اور حلقۂ عمل جُدا جُدا میں شاید اپنے صوبہ میں پہلا تعلقہ دار تھا جس نے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی ہو۔ حکام نے پہلے تو میری خوب آؤ بھگت کی لیکن جب میرے تمدنی اصولوں سے واقف ہوئے تو سرد مہری کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے بھی اُن سے ملنا جُلنا چھوڑ دیا۔ میں اپنا بیشتر وقت اپنے ہی علاقے میں صرف کرتا تھا۔ سال بھر نہ گذرنے پایا تھا کہ ایک تعلقہ دار صاحب انتقال ہو گیا۔ وہ کونسل کے قطب ہو رہے تھے۔ اُن کی جگہ خالی ہوتی۔ میں نے کونسل میں جانے کی اپنی طرف سے مطلق کوشش نہیں کی لیکن کاشتکاروں نے اپنی نیابت کا بار میرے ہی سر رکھا۔ غریب کیشو تو اپنے

کالج میں لکچر دیتا تھا۔ کتابوں کے مطالعہ سے صحت اور نگاہ دونوہی کمزور ہوتی جاتی تھیں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ کہ یونیورسٹی کا وہ نام روشن کرنے والا نوجوان کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اِدھر میں اپنی خاندانی ثروت اور امتیاز کی بدولت کونسل کا ممبر ہوگیا۔ میری تقریریں اخباروں میں درج ہونے لگیں۔ میرے سوالات کی داد ملنے لگی۔ کونسل میں بھی میرا خاص اعزاز ہونے لگا۔ وہی حکام جو پہلے مجھ سے بے التفاتی کا برتاؤ کرتے تھے۔ اب میری عزت کرنے لگے۔ میں نے چند ہمخیال ممبروں کے ساتھ کونسل میں احرار کی ایک جماعت بنالی۔ اور کاشتکاروں کے حقوق کی زور دل کے ساتھ وکالت کرنے لگا۔ اکثر تعلقہ داروں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا کئی اصحاب نے دھمکیاں بھی دیں لیکن میں نے اپنے رویہ میں ذرا بھی ترمیم نہ کی۔ میں خدمت کے ایسے زریں موقع کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتا۔ دوسرا سال ختم ہوتے ہوتے کونسل میں میری شخصیت نمایاں ہوگئی۔ قوم کے خاص آدمیوں میں میرا شمار ہونے لگا۔ مجھے شاقہ محنت کرنا پڑتی تھی۔ پڑھنے لکھنے اور بولنے میں مجھے کالج میں اتنی محنت نہ کرنی پڑتی تھی۔ اکثر سوالوں کی تیاری میں رات کے ایک دو بج جاتے۔ پر میں ذرا بھی نہ گھبراتا تھا۔ یہ سب کیشو کی رقابت کا نتیجہ تھا جس نے محنت کا عادی بنا دیا تھا۔

میرے پاس کیشو اور پروفیسر بھاٹیہ کے خطوط برابر آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی لجیاوتی بھی لکھتی۔ اس کے خطوط روز بروز زیادہ ہمدردانہ اور محبت آمیز ہوتے جاتے تھے۔ وہ میرے قومی انہماک کی فیاضانہ داد دیتی۔ میری نسبت اس کے دل میں جو شکوک تھے۔ وہ بظاہر مٹتے جاتے تھے۔ میری تپسیا سپھل ہونے لگی کیشو

کے خطوط سے افسردہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے کالج میں سرمایہ کافی نہ تھا۔ اُسے پروفیسری کرتے تین سال ہو گئے تھے۔ پر اس کی ترقی نہ ہوئی تھی۔ اور خطوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ زندگی سے بیزار ہے۔ غالباً اس کا خاص سبب یہ تھا کہ ابھی تک اُس کی زندگی کا سنہرا خواب پورا نہ ہُوا تھا۔

تیسرے سال گرمیوں کی تعطیل میں پروفیسر بھاٹیہ مجھ سے ملنے آئے۔ اور بہت خوش گئے۔ اس کے ایک ہی ہفتہ بعد لجیا وتی کا خط آیا۔ عدالت نے فیصلہ سنا دیا میری ڈگری ہو گئی۔ کیشو کو میرے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پروفیسر بھاٹیہ کا قصد تھا کہ ہندوستان کے ہر ایک صوبہ کا دورہ کریں وہ اقتصادیات پر ایک کتاب لکھ رہے تھے جس کے لئے ہر ایک بڑے شہر میں کچھ تحقیقات کرنے کی ضرورت تھی۔ لجیا وتی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا کہ ان کی واپسی پر چیت کے مہینہ میں شادی رچے۔ میں یہ انتظار کا زمانہ بڑے اشتیاق اور بے صبری کے عالم میں کاٹنے لگا۔ جب تک مجھے معلوم تھا کہ بازی کیشو کے ہاتھ رہے گی۔ میں مایوس تھا۔ دل نے صبر کی پناہ لی تھی۔ اب اُمید تھی۔ اور اُسی کے ساتھ بے صبری بھی۔

۳

مارچ کا مہینہ تھا۔ انتظار کی مدت پوری ہو گئی تھی۔ کڑی محنت کے دن گئے۔ فصل کاٹنے کے دن آئے۔ پروفیسر صاحب نے ڈھاکہ سے خط لکھا تھا۔ کئی وجوہ سے میں مارچ میں نہ آسکوں گا۔ مئی میں آؤں گا۔ یہ التوا اب شاق گذرتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک ریاست کے دیوان لالہ سومناتھ کپور نینی تال کی سیر کرنے آئے۔ گورنر کی

جانب سے ان کی دعوت ہوئی۔ کونسل کے ممبروں کو بھی نوید ملا۔ طرفین سے رسمی
تقریریں ہوئیں۔ کونسل کی طرف سے میں نے مہمان نوازی کا فرض ادا کیا۔ میری تقریر
سے دیوان صاحب کچھ زیادہ متاثر ہوئے۔ چلتے وقت مجھ سے خاص طور پر ہاتھ
ملایا۔ اور اپنے فرودگاہ پر آنے کی دعوت دی۔ اُن کے ساتھ اُن کی صاحبزادی
سوشیلا بھی تھی۔ وہ پیچھے سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں زمین میں گڑی ہوئی
تھیں۔ پر میں اپنی نگاہوں پر قادر نہ ہو سکا۔ وہ دورانِ گفتگو میں ایک نہیں کئی بار
اُٹھیں اور جیسے بچہ کسی اجنبی کی گود کی طرف اپکتا ہے۔ مگر پھر خائف ہو کر ماں کی
گود سے چمٹ جاتا ہے۔ اسی طرح آدھے راستے ڈر کر لوٹ آئیں۔ اس کی طرف تاکنے
کی ہمت نہ پڑی۔ لجیا وتی اگر شگفتہ باغ تھی۔ تو سوشیلا خنداں کوہسار جہاں دلفریب
ہریالی تھی۔ اور نرم ریزہ جھرنے اور غزالانِ مست کے غول۔ سارا منظر قدرت کے
رنگ میں رنگا ہوا جس سے انسان کے دل پر ایک رعب سا طاری ہو جاتا ہے
میں گھر پر آیا تو ایسا تھکا ہوا تھا۔ گویا منزل طے کر کے آیا ہوں حسن تناسب ازلی
ہے معلوم نہیں اس کا اثر اتنا جاں فرساں کیوں ہوتا ہے۔

لیٹا تو وہی صورت سامنے تھی۔ میں اسے ہٹانا چاہتا تھا۔ مجھے خوف تھا
کہ ایک لمحہ کی بے احتیاطی بھی مجھے مغلوب کر دے گی۔ میں اب لجیا وتی کا ہو چکا تھا
وہی اب میرے دل کی مالک تھی۔ میرا اس پر کوئی اختیار نہ تھا لیکن میری ساری
احتیاط۔ میری ساری دلیلیں بے سود تھیں۔ سیلاب میں کشتی کو دھاگے سے کون
روک سکتا ہے۔ یہاں تک کہ مایوس ہو کر میں نے اپنی کشتی کو خیال کی رو میں ڈال دیا
کچھ دور تک کشتی تند لہروں کے ساتھ چلی۔ پھر اسی رو میں سما گئی۔ اسی سیلاب کا

ایک جزو بن گئی۔

دوسرے دن معینہ وقت پر دیوان صاحب کے بنگلہ پر پہنچا۔ اس طرح کانپتا اور ہچکچاتا۔ جیسے کوئی بچہ بجلی کی کڑک سے ڈر کر آنکھیں بند کر لیتا ہے کہیں وہ چمک نہ جائے۔ کہیں اسے دیکھ نہ لوں۔ کہیں وہ مجھ سے کچھ پوچھ نہ بیٹھے! عدالت کے سامنے کوئی بھولا بھالا کسان بھی اتنا سراسیمہ نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے میں بالکل مغلوب اور پامال ہو چکا تھا۔ مجھ میں اب مقابلہ کی مطلق قوت نہ تھی۔

دیوان صاحب نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ کوئی گھنٹہ بھر تک ملکی اور مالی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی وسعتِ معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ ایسا لطیفہ گو۔ بذلہ سنج شخص میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ساٹھ سال کا سن تھا۔ مگر ظرافت اور خوش طبعی چھلکی پڑتی تھی۔ نہ جانے کتنے اشعار۔ کتنے اشلوک انہیں حفظ تھے۔ اور حافظ تو انہیں وردِ زبان تھا۔ میں رہ رہ کر ادھر ادھر بیتاب آنکھوں سے تاکتا تھا۔ اس کی کوئی آواز سننے کے لئے میرے کان لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں کہیں تھیں۔ دل کہیں اور تھا۔ اور کشمش بھی تلخی بھی پُر سرور کے ساتھ۔

رات کے نو بج گئے۔ میرے چلنے کا وقت آ گیا۔ دل میں نادم تھا۔ دیوان صاحب کیا کہتے ہونگے؟ اسے کوئی کام نہیں ہے کیا؟ جاتا کیوں نہیں؟ دو ڈھائی گھنٹے ہو گئے۔ ساری باتیں ختم ہو گئیں۔ ان کے لطیفے بھی ختم ہو گئے۔ دلوں پہ افسردگی چھا گئی۔ جو زندہ دلانہ گفتگو کا تتمہ ہوتی ہے۔ کئی بار اٹھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن انتظار میں تو عاشق کی جان بھی نہیں نکلتی۔ یہاں تک کہ ساڑھے نو بجے اور اب مجھے رخصت ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تمنائیں پامال ہو گئیں ہیں جیسے

جسے وحشت سمجھا تھا۔ وہ فی الواقع انتہائے اشتیاق تھی۔

یہاں سے چلا تو ایسا مغموم اور پژمردہ تھا گویا ایمان نکل گیا ہے۔ اپنے تئیں نفریں کرنے لگا۔ اپنی شوریدہ سری کو خوب ملامت کی۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ یہاں کسی کو تمہاری خبر ہی نہیں۔ کسی کو تمہارے عدم یا وجود کی پروا ہی نہیں۔ وہ علاوہ ستوں سے کنواری سہی۔ دنیا میں کنواری لڑکیوں کی کمی نہیں۔ حسن کی بھی انتہا نہیں۔ اگر ہر ایک حسین اور کنواری لڑکی کو دیکھ کر تمہاری یہی حالت ہوتی رہی۔ تو تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی۔

دل نے جواب دیا۔ علیٰ ہذا یہی دلیل اس کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہر ایک خوش رو، خوش زبان نوجوان کی طرف اس کی نگاہ کیوں اٹھے۔ مردوں کے لئے اگر یہ باعث رسوائی ہے۔ تو عورتوں کے لئے باعث بربادی۔ دوئی سے توحید کو بھی اتنا صدمہ نہیں ہو سکتا۔ جو حسن کو ہو سکتا ہے۔

دوسرے روز شام کو میں اپنے بنگلہ کے برآمدہ میں بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ کلب جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ طبیعت کسلمند تھی۔ دفعتاً میں نے دیوان صاحب کی فٹن پر جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے پہلو میں شوشیلا بھی تھی۔ مجھے ایسا وہم ہوا کہ وہ میرے بنگلہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہ اوپر اٹھی ہو یا نہ اٹھی ہو۔ پر میری ٹکٹکی اس وقت تک بندھی رہی جب تک فٹن نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

دوسرے دن میں اسی وقت پھر برآمدہ میں آ کر بیٹھا۔ آنکھیں سر راہ تھیں۔ فٹن آئی اور چلی گئی۔ اب قریب قریب اس کا روزانہ یہی معمول ہو گیا۔ میرا کام اب یہ تھا۔ کہ سارا دن برآمدہ میں بیٹھا رہوں۔ معلوم نہیں فٹن کب نکل جائے۔ خصوصاً سہ پہر کے بعد

تو میں ہلنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔

ایک مہینہ گذر گیا۔ مجھے کونسل سے اب کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اخباروں میں مہاشوں میں ملکی معاملات میں اب جی نہ لگتا۔ کبھی سیر کرنے کو بھی جی نہ چاہتا۔ عشاق ء جانے صحرا کی طرف کیوں کر جاتے ہیں۔ میرے تو جیسے پیر دل میں بیڑیاں پڑ گئی ہوں۔ بس برآمدہ تھا اور میں اور فٹن کا انتظار۔ میری قوتِ فکر بھی شاید سلب ہو گئی تھی۔ میں کم سے کم ہفتہ میں ایک بار دیوان صاحب کی فرودگاہ پر جا سکتا تھا۔ انہیں اپنے یہاں مدعو کر سکتا تھا لیکن حقیقت میں میں ابھی تک اِس سے خائف اور ہراساں تھا۔ لجیا دتی کو اب بھی اپنے دل کی رانی سمجھتا تھا۔ گو ایک غاصب نے اس پر چند روزہ قبضہ کر لیا ہو ایک مہینہ گذر گیا۔ لیکن میں نے لجیا کو ایک خط بھی نہ لکھا۔ مجھ میں خط لکھنے کی شاید شکست ہی نہ تھی۔ شاید اسے خط لکھنے کی مجھ میں اخلاقی جرأت ہی نہ تھی۔ میں اب خطا دار تھا۔ مجھے اپنے خیال سے بھی اسے ملوث کرنیکا مجاز نہ تھا۔

اِس کا انجام کیا ہو گا؟ میرے دل پر ہر دم یہی فکر مسلط رہتی تھی۔ زندگی کی کسی شئے سے دلچسپی نہ تھی۔ روز بروز گھلا جاتا تھا۔ احباب اکثر پوچھتے آپ کو کیا شکایت ہے۔ چہرہ پر زردی اور بے رونقی تھی۔ کھانا دوا کی طرح کھاتا۔ سونے جاتا تو جیسے کوئی پنجرہ میں بند کر دیا ہو۔ کوئی ملاقات کو آتا۔ تو ایسا معلوم ہوتا۔ گویا روپے کا تقاضہ کرنے آیا ہے۔ عجیب حالت تھی۔

ایک روز شام کو دیوان صاحب کی فٹن میرے دروازے پر آ کر رکی! انہوں نے اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ شائع کرایا تھا۔ اِسکی ایک جلد مجھے نذر کرنے آتے تھے میں نے ہر چند بیٹھنے کا اصرار کیا۔ لیکن انہوں نے کہا۔ سوشیلا کو یہاں بیٹھنے میں تامل

ہوگا اور فٹن پر اکیلی بیٹھی گھبرا رہی ہوگی یہ کہہ کر چلے ۔ میں بھی ساتھ ہو لیا ۔ اور فٹن تک آیا ۔ جب وہ فٹن پر بیٹھ گئے ۔ تو میں نے سو شیلا کی طرف بے خوف ہو کر دیکھا ۔ معلوم نہیں ۔ کب یہ زریں موقع پھر ملے ۔ وہ التجا ۔ وہ اشتیاق ، وہ اضطراب ، وہ بیکسی ۔ وہ پرستش ، وہ اصرار ، جو میری ایک نگاہ میں تھا پتھر کو بھی مائل کر دیتا ۔ شو شیلا ۔ تو پھر بھی انسان تھی ۔ اُس نے میری طرف دیکھا ۔ بے تکلف ، بے باک نگاہوں سے ۔ ذرا بھی جھجک نہیں مجھے ایسا معلوم ہوا ۔ جیسے اُس نے مجھ پر اپنی نگاہوں سے کوئی جادو کر دیا ۔ میری روح اور دل میں کوئی نئی طاقت پھونک دی ۔ جیسے ڈوبتے کو بچا لیا ۔ بر آمدہ کی طرف لوٹا تو ایسا خوش تھا ۔ گویا قارون کا خزانہ مل گیا ۔ وہ ایک نگاہ میرے لئے کونین کی دولت سے کم نہ تھی ۔

دوسرے دن میں نے پروفیسر بھاٹیہ کو ایک خط لکھا ۔ مجھے کچھ عرصہ سے کثرتِ کار کے باعث ایک شکایت پیدا ہو گئی ہے جو ممکن ہے تپ دق کا آغاز ہو ۔ اس لئے میں اپنے تئیں تاہل کے قابل نہیں سمجھتا ۔ میں لجیا وتی سے اس طرح الگ ہونا چاہتا تھا کہ اس کی نظروں میں میری عزت بدستور قائم رہے ۔ میں کبھی کبھی اپنی خود غرضی پر جھنجلاتا لجیا کے ساتھ یہ بیوفائی اور دغا کرتے ہوئے میں اپنی ہی نگاہ میں حقیر معلوم ہوتا تھا مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوتی تھی لیکن طبیعت سے مجبور تھا ۔ اس غریب کو کتنا صدمہ ہوگا ۔ اس خیال سے مجھے کئی بار رونا آیا ۔ شو شیلا اب تک میرے لئے ایک سربستہ راز تھی ۔ محض اس کے حسن کی بنا پر میں اپنی مدتوں کی تمناؤں کا خون کر رہا تھا ۔ بچوں کی طرح مٹھائی کے نام پر اپنے دودھ چاول کو ٹھکراتے دیتا تھا ۔ میں نے پروفیسر صاحب سے التماس کیا تھا ۔ کہ میری حالت کا لجیا سے ذکر نہ کیجئے گا ۔ مگر چوتھے دن

لجیا کا خط آ گیا جس میں اُس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے لئے سب کچھ یہاں تک کہ بیوگی کا عذاب سہنے کے لئے بھی آمادہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد ہم ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ اب اُسے ایک دن کی دیر بھی اکھرتی تھی۔ میں اس خط کو لئے گھنٹوں ایک محویت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔

۴

لجیاوتی

ساوتری نے کیا سب کچھ جان بوجھ کر ستیا وان سے شادی نہیں کی ہیں۔ کیوں ڈروں؟ میں ان کے لئے برت رکھ دوں گی۔ تیرتھ کر دوں گی۔ تپسیا کر دوں گی۔ مگر محض مصیبتوں کا خوف مجھے اُن سے جدا نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں مجھے کبھی ان سے اتنی محبت نہ تھی میں کبھی اتنی بیقرار نہ تھی یہی میری آزمائش کا وقت ہے۔ اور میں نے آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ والد صاحب ابھی سفر سے واپس آئے ہیں۔ ہاتھ خالی ہے۔ کوئی تیاری نہیں کر سکتے۔ دو چار مہینوں کے التواء سے انہیں کچھ تیاری کا موقع مل جاتا۔ پر میں اب دیر نہیں کر سکتی۔ ہم اور وہ اسی مہینہ میں ہمیشہ کے لئے مل جائیں گے۔ پھر کوئی حادثہ، کوئی آفت، کوئی بلا مجھے ان سے جدا نہیں کر سکتی۔

اب مجھے ایک ایک منٹ علیحدہ رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ میں رسموں کی غلام نہیں ہوں۔ نہ وہ ہی ہیں۔ بابو جی بھی رسم پرور نہیں۔ پھر میں کیوں آج ہی نینی تال چلوں؟ ان کی خدمت کروں، تیمارداری کروں، تشفی دوں، میں انہیں زندگی کے سہار

فکر اور تردد سے آزاد کر دوں گی۔ علاقہ کا سارا انتظام اپنے اوپر لے لوں۔ کارِ کونسل میں اس درجہ مصروف رہنے کے باعث ہی ان کی یہ حالت ہوتی ہے۔ اخباروں میں زیادہ تر انہیں کے سوالات، انہیں کی نکتہ چینیاں۔ انہیں کی تقریریں نظر آتی ہیں۔ میں ان سے استدعا کروں گی کہ کچھ دنوں کے لئے کونسل سے استعفا دے دیں۔ وہ جب چاہیں کونسل میں جا سکتے ہیں۔ ان کے لئے ہمیشہ جگہ خالی رہے گی۔ وہ میرا گانا کتنے شوق سے سنتے تھے۔ میں اپنے گیت سُنا کر ان کا دل بہلاؤں گی۔ قصے پڑھ کر سناؤں گی۔ ان کے اطمینان میں کسی بات کو مخل نہ ہونے دوں گی۔ اس بیماری کا علاج یہاں تو معقول نہیں ہوتا۔ میں ان سے پیروں پڑ کر کہوں گی کہ یورپ کے کسی سینی ٹوریم (صحت افزا مقام) میں معالجہ کے لئے چلیے۔ میں کل ہی کالج کے کتب خانہ سے اس مرض کے متعلق کتابیں لاؤں گی۔ اور غور سے پڑھوں گی۔ اب میرا یہاں ایک پل بھر بھی رہنے کو جی نہیں چاہتا کالج دو چار دن میں بند ہو جائے گا۔ میں آج ہی بابوجی سے نینی تال چلنے کی گفتگو کروں گی۔

۵

آہ میں نے کل انہیں دیکھا تو پہچان نہ سکی۔ کیسا سرخ، سفید چہرہ تھا۔ کیسا بھرا ہوا بدن معلوم ہوتا تھا۔ صحت انہیں کے لئے بنی ہے۔ تین سال میں یہ کیفیت ہو گئی۔ چہرہ پر کتنی غضب کی زردی چھائی ہوتی ہے۔ خوراک آدھی بھی نہیں رہی نہ جانے کس فکر میں غرق رہتے ہیں کہیں آتے جاتے نہیں دیکھتی۔ اتنے نوکر چاکر ہیں ایسا وسیع پُر فضا بنگلہ ہے۔ اس قدر سامان موجود ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے۔ زندگی سے اب انہیں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ اس کا کل منحوس بیماری کا ستیاناس ہو

اگر اس کمبخت کو کسی شکار کی ضرورت تھی تو مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ میں بڑے شوق سے اس کا خیر مقدم کرتی۔ کاش کوئی ایسی تدبیر ہوتی۔ کہ یہ مرض ان کے بدلے مجھے ہو جاتا! انھیں دیکھ کر پہلے کیسے باغ باغ ہو جاتے تھے۔ آنکھیں مسکرانے لگتی تھیں۔ ایک ایک عضو سے مسرت ٹپکنے لگتی تھی۔ جیسے فوارے سے ترشح ہونے لگتا ہے۔ پر مجھے یہاں آتے دوسرا دن ہے۔ ایک بار بھی چہرہ پر ہنسی نہیں آئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے ضرور تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا محض مجھے خوش کرنے کے لئے۔ بابو جی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔ الگ کمرہ میں دیر تک روتے رہے۔ کہتے ہیں لوگ کونسلوں میں محض اعزاز و نمود کے لئے جاتے ہیں محض ناموری کی [illegible] انہیں کھینچ لے جاتی ہے۔ لوگ ان غریب ممبروں کے ساتھ کتنی ناانصافی کرتے ہیں کتنی بے [illegible] ہے۔ قومی خدمت میں جسم کا یہ حال ہوتا ہے۔ خون جلانا پڑتا ہے۔ آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں۔ مرتاض بننا پڑتا ہے۔ مگر ان کی تو یہ حالت ہے اور نوکر چاکر سب اپنی دھن میں مست ہیں۔ کسی کو متفکر نہیں دیکھتی۔ دو ایک احباب ملنے آئے تھے۔ وہ بھی متردد نظر آتے تھے۔ بابو جی نے ان سے ذکر بھی کیا تو وہ ملتفت نہ ہوئے۔ یہ ہے انسانی ہمدردی کا حال کسی کو خبر نہیں۔ دوسروں پر کیا گذر رہی ہے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تپ دق کا وہم ہے۔ اس کی کوئی علامت نہیں دیکھتی۔ پرماتما کرے میرا قیاس صحیح ہو۔ نہیں تو کوئی اور ہی شکایت معلوم ہوتی ہے۔ میں نے کئی بار حرارت دیکھی۔ معمولی حرارت تھی۔ کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اگر وہی بیماری ہے تو ابھی ابتدائی حالت میں ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ کافی احتیاط سے صحت کیوں نہ ہو جائے۔ میں کل ہی سے انہیں روزانہ ہوا خوری کے لئے مجبور کروں گی۔ موٹر کی ضرورت نہیں۔ فٹن پر آہستہ

آہستہ چلنے میں زیادہ تفریح ہوگی۔ مجھے تو یہ اپنی طرف سے کچھ بے پرواہ نظر آتے ہیں
اس مرض کے مریضوں کو بہت احتیاطیں کرتے دیکھا ہے۔ دن میں بیسیوں بار تو
حرارت کا اندازہ کرتے ہیں۔ انواع و اقسام کی مرغن اور مقوی غذائیں کھاتے
ہیں۔ ضرور انہیں کوئی دوسری شکایت ہے۔ ذرا اطمینان ہو جائے تو ایک بار اُن سے
مفصل گفتگو کروں۔ خدانخواستہ مالی تردّدات تو نہیں ہیں۔ ریاست پر کوئی بار تو نہیں۔
کوئی نہ کوئی باعث ضرور ہے۔

۶

دل گوناگوں فکروں سے اتنا دبا ہوا ہے کہ کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ میری
ساری تمنائیں پامال ہوگئیں۔ وائے حسرت میں اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب سمجھتی
تھی۔ اب دنیا میں مجھ سے زیادہ بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ کیا شومیٔ تقدیر ہے۔ کتنی
نارسائی بخت! جو نعمت مجھے مدت دراز کی ریاضت اور عبادت سے بھی نہ ملی وہ اس
غزال چشم حسینہ کو بے ستم مل جاتی ہے۔ شاردا نے ابھی اُسے صرف تین چار مہینوں سے
دیکھا ہے۔ شاید یکجا بیٹھ کر ہمکلام ہونے کی نوبت اب تک نہیں آئی ہے۔ لیکن کتنے
دیوانہ ہو رہے ہیں۔ مردوں کے دل پر حسنِ ظاہر کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ وہ دل کی
قدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ اگر مجھے یقین ہو جاتے کہ شوشیلا انہیں مجھ سے زیادہ خوش
رکھ سکے گی۔ تو میں بڑے شوق سے انہیں اس کے ہاتھوں میں دیدوں۔ مجھے یہ اطمینان
نہیں ہوتا۔ وہ اتنی مغرور ہے۔ اتنی خود پرور۔ اتنی بے مہر کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاردا کو
پچھتانا نہ پڑے۔

مگر یہ میری خود غرضی ہے۔ شوشیلا مغرور سہی بے مہر سہی۔ شاردا اس پر

دل و جان سے شیدا ہو رہے ہیں۔ وہ خود ذی فہم ہیں۔ دور اندیش ہیں جانا ہیں اپنا نفع و نقصان خود سوچ سکتے ہیں جب انہوں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لیا ہے تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ان کی راہ مسرت کا کانٹا بنوں۔ مجھے اپنے دل پر جبر کر کرکے۔ صبر کرکے، یہاں سے بصد حسرت رخصت ہو جانا چاہئے۔ میری یہ ہی خواہش ہے کہ پرماتما انہیں خوش و خرم رکھے۔ مجھے ذرا بھی حسد، ذرا بھی ملال نہیں ہے میں ان کی خوشی کی طالب ہوں۔ اگر انہیں مجھے زہر دینے سے خوشی ہوتی تو مجھے زہر کھانے میں بھی دریغ نہ تھا۔ اگر محض میری کنارہ کشی سے سارے کام سنور سکتے ہیں تو مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ یہی ان کا فیصلہ ہے۔ ان کے سامنے میرا سر خم ہے۔ مگر آخر انسان ہوں کمزور ہوں جن آرزوں کو مدت سے پالا تھا۔ ان کی پامالی سے مجھے صدمہ ہوتا ہے۔ ہائے اب انکار کام نہیں کرتی۔ آنسو امڈے چلے آتے ہیں۔ کیسے ضبط کروں؟ جسے اپنا سمجھتی تھی۔ جسے اپنے تئیں نثار کر چکی تھی جس پر زندگی کی دیوار کھڑی تھی۔ جسے گوشہ جگر میں بٹھا کر پوجتی تھی جس کی خوشیوں کے خواب دیکھنا زندگی کا سب سے پیارا مشغلہ تھا۔ اُس سے اب جدا ہو رہی ہوں۔ آہ! ہمیشہ کے لئے۔ کس سے فریاد کروں کس کے سامنے روؤں۔ اس صدمہ سے جانبر نہیں ہو سکتی۔ قسمت کی یہ چوٹ میری جان لے کر چھوڑے گی۔ دنیا تاریک ہے۔ زندگی خشک ہے۔

میں جانتی ہوں۔ شاردا سے بابوجی آج شادی کے لئے زور دے کر کہیں تو وہ تیار ہو جائیں گے۔ وہ مروت پر، دلجوئی پر، محض میرا دل رکھنے کے لئے اپنی خواہشوں کو قربان کر سکتے ہیں۔ انہوں نے ابھی تک سوشیلا کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے

وہ میرا رخ دیکھ رہے ہیں۔ غالباً اسی کشمکش نے ان کی یہ حالت بنا رکھی ہے لیکن میں تو ان کی محبت کی بھوکی ہوں مجھے ثروت وحشمت کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کریں گے کبھی میرا دل نہ دکھائیں گے۔ شوشیلا کا ذکر کبھی بھول کر بھی ان کے لب پر نہ آئیگا۔ وہ دل میں کڑھیں گے گھلیں گے۔ مگر ان کی ذات سے بعید ہے۔ کہ میرے ساتھ سرد مہری یا بے وفائی کا برتاؤ کریں میں ان کے مزاج سے خوب واقف ہوں لیکن میں ان کے پاؤں کی زنجیر بننا نہیں چاہتی۔ جو کچھ گذرے اپنے ہی اوپر گذرے۔ انہیں کیوں سمیٹوں۔ خود ہی کیوں نہ ڈوبوں۔ انہیں اپنے ساتھ کیوں ڈباؤں ؟ یہ بھی جانتی ہوں۔ کہ اگر اس صدمہ نے مجھے گھلا گھلا کر مار ڈالا۔ تو وہ اپنے تئیں کبھی معاف نہ کریں گے۔ ان کی ساری زندگی تلخ ہو جائے گی۔ ان کا سکونِ قلب رخصت ہو جائے گا۔ میں انہیں ہمیشہ رلایا کروں گی۔ میری یاد ہمیشہ انہیں تڑپایا کرے گی۔ ہائے ستم ! مجھے مرنے کی بھی آزادی نہیں۔ مجھے ان کو خوش رکھنے کے لئے اپنے کو خوش رکھنا ہوگا۔ ان سے بیوفائی کرنی پڑے گی۔ دکھانا پڑے گا۔ کہ اس بیماری کے باعث ہماری شادی خارج از بحث ہے۔ پیمان شکنی کا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔ زہر کھانا ہے۔ اور دعائیں دینی ہیں۔ کوئی چارہ نہیں۔ پرماتما ! مجھے ہمت دو کہ میں ان مصیبتوں کا سامنا کر سکوں۔

۷

شاردا چرن

ایک نگاہ نے میرے دل کا فیصلہ کر دیا۔ لجیا دتی نے مجھے جیت لیا۔ ایک ہی نگاہ سے شوشیلا نے بھی مجھے جیتا تھا۔ اس نگاہ میں غضب کی کشش تھی۔ ایک دلاویز شوخی

ایک طفلانہ مسرت، گویا اسے کوئی کھلونہ مل گیا ہے۔ ایک فاتحانہ غرور گویا تلاش کی بازی جیت لی۔ لجیاوتی کی نگاہ میں نرمی تھی۔ اور حسرت اور درد اور ایثار۔ وہ اپنے کو میری خوشیوں پر قربان کر رہی تھی۔ تیا فہ میں اُسے ملکہ ہے۔ اس نے محض فراست سے میرے دل کی کیفیت کا مطالعہ کر لیا۔ سوشیلا کے انداز اور میری فریفتگی نے اُس کے خیال کی تائید کر دی۔ اُس لئے فوراً فیصلہ کر لیا۔ وہ میری خوشیوں میں مخل نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا نہ چاہتی تھی۔ کہ اُسے میرے انحراف سے کچھ ملال ہے۔ وہ یہ دکھانا نہ چاہتی تھی۔ کہ اگر تم مجھ سے بالشت بھر ہٹو گے تو میں تم سے گز بھر ہٹ جاؤنگی مگر دل پر پردہ ڈالنا مشکل کام ہے۔ اس کی بے اعتنائی میں مایوسانہ حسرت تھی۔ اُس کے تبسم میں پژمردگی۔ وہ میری نگاہ بچا کر کیوں رسوئی چلی جاتی تھی۔ اور کوئی چیز جسے وہ جانتی ہے۔ کہ مجھے مرغوب ہے بنا آتی ہے۔ وہ خدمت گاروں سے کیوں مجھ سے چھپا کے میرے آرام کی تاکید کرتی تھی۔ وہ اخباروں کو کیوں میری نگاہ سے پوشیدہ رکھتی تھی۔ وہ شام کے وقت کیوں مجھے سیر کرنے کے لئے مجبور کرتی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت ایک بات بات۔ اس کے راز دل کو افشا کر رہی تھی۔ دل شناسی صنفِ نازک ہی کے حصہ میں نہیں آئی ہے۔ اس کا شاید اُسے علم نہیں ہے۔ اُسی دن جب پروفیسر بھاٹیہ نے باتوں ہی باتوں میں مجھ پر طنز کئے۔ مجھے ثروت اور دولت کا غلام کہا۔ اور میری مساوات کی تضحیک کرنی چاہی تو اس کا چہرہ کیسا تمتما اٹھا معلوم نہیں بعد کو باپ بیٹی میں کیا کیا باتیں ہوئیں پر میں برآمدہ میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ کہ ان میں کوئی گرم مباحثہ ہو رہا ہے۔ کون ایسا انسان ہے۔ جو اس بے غرض خدمت کا غلام نہ ہو جاتے۔ لجیاوتی کو میں بہت دنوں سے جانتا لیکن میں نے اسکی حقیقت اسی ملاقات میں پہچانی۔ پہلے میں اُس

کے حسن کا۔ اس کی شیریں گفتاری کا۔ اُس کی خوش ادائی کا شیدا تھا۔ اُس کے دل کے نازک ترین احساسات میری نظروں سے چھپے ہوئے تھے۔ میں نے اب کے جانا کہ اس کی محبت کتنی گہری ہے کتنی بے غرض، کتنی پاک دوسری عورت ایسے موقعہ پر حسد سے باؤلی ہو جاتی۔ مجھ سے نہیں تو شو شیلا سے تو ضرور ہی جلنے لگتی خود جلتی اسے جلاتی اور مجھے بیوفا، دغا شعار، بوالہوس، جانے کیا کیا کہتی۔ مگر لجیا وتی کو جب یقین ہو گیا۔ کہ سوشیلا نے میرے دل میں اُس کی جگہ لے لی۔ تو وہ کتنی خندہ پیشانی سے اس سے ملی۔ کیسے خلوص سے اُسے گلے لگایا۔ میل کدورت۔ تنگ نظری کا شائبہ تک نہ تھا معلوم ہوتا تھا۔ بڑی بہن ہے۔ سو شیلا پر تسخیر کا عمل ہو گیا۔ آہ! وہ رخصتی سماں مجھے کبھی نہ بھولے گا پروفیسر بھاٹیہ موٹر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ بدظن ہو گئے تھے۔ یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لجیا وتی ایک سفید سادہ ساڑھی پہنے میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ عفت اور پاکیزگی کی دیوی تھی۔ اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ کبھی کبھی خط بھیجتے رہنا۔ میرا اتنا حق تو ہے ہی۔

میں نے جوش سے کہا۔ روزانہ نہیں تو دوسرے روز ضرور میرا خط پہنچیگا۔ تم بھی اپنی خیریت سے اطلاع دیتی رہنا۔

لجیا وتی نے پھر کہا۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ معلوم نہیں میں کہاں ہونگی۔ کہاں جاؤنگی۔ نہیں معلوم کل کیا ہو۔ اگر میری زبان سے کوئی بات نکل گئی ہو۔ جس سے تمہیں صدمہ ہوا ہو۔ تو اُسے معاف کر دینا۔ اور سب سے بڑی التجا یہ ہے کہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ وہ کانپ رہے تھے۔ شاید

آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے کے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ اپنے ضبط پر اُسے اب اعتماد نہ تھا۔ اُس نے میری طرف صرف ایک دبی ہوئی آواز سے دیکھا۔ نظر ملانے کی اُسے جرأت نہ تھی۔ مگر ان نیم وا آنکھوں میں بندھے ہوئے پانی کی تیزی اور شورش تھی۔ بس اس سیلاب میں بہ گیا۔ میں نے فوراً اس کے ہاتھ پکڑ لئے اور بولا۔ نہیں لجیا وتی۔ اب ہم اور تم کبھی جدا نہ ہونگے۔

دفعتاً ایک آدمی نے سوشیلا کا خط میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ لکھا تھا۔

ڈیر شاردا۔

ہم لوگ کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں آج بہت مصروف ہوں اسلئے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ میں نے آج رات کو فیصلہ کر دیا۔ میں لجیا وتی بہن کی آرزوؤں کا خون نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یہ بات پہلے مطلق معلوم نہ تھی۔ ورنہ اتنے ارتباط کی نوبت نہ آتی۔ میری آپ سے بھی سفارش ہے۔ کہ لجیاوتی کو ہاتھ سے نہ جانے دیجئے۔ میں جانتی ہوں کہ میں ان سے زیادہ حسین ہوں۔ مگر مجھ میں وہ روحانی عروج، وہ تیاگ۔ وہ بے نفسی نہیں ہے۔ میں آپ کو خوش رکھ سکتی ہوں لیکن آپ کی زندگی کو سنوار نہیں سکتی۔ اُسے زیادہ رفیع، زیادہ پاک نہیں بنا سکتی۔ لجیا وتی دیوی ہے۔ وہ آپ کو دیوتا بنا دیگی۔ میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتی۔ والسّلام۔ کل مجھ سے ملنے کا ارادہ نہ کیجئے گا۔ رونے رلانے سے کیا فائدہ۔ الوداع۔

میں نے خط لجیا وتی کو دے دیا۔ وہ پڑھ کر بولی۔ میں اُس سے آج ہی ملنے

جائونگی میں نے اُس کا منشا سمجھ کر کہا معاف کرو میں تمہاری نیا نبی کا دوبارہ امتحان نہیں لینا چاہتا۔

یہ کہہ کر میں پروفیسر بھاٹیہ کے پاس گیا۔ وہ موٹر پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ میری جگہ گر لجیاوتی آئی ہوتی۔ تو ضرور ہی اُس پر برس پڑتے۔

میں نے اِن کے قدموں پر سر جھکا کر کہا۔ آپ نے مجھے ہمیشہ اپنا بیٹا تصوّر کیا ہے اب اس رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیجئے۔

پروفیسر بھاٹیہ نے پہلے تو میری طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر مُسکرا کر بولے۔ یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی تمنّا تھی۔

دستِ غیب

لالہ جیون داس کو بستر مرگ پر پڑے ہوئے چھ مہینے گذر گئے ہیں۔ حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی ہے حکما پر اب انہیں مطلق اعتماد نہیں رہا محض تقدیر کا بھروسہ ہے۔ کوئی ہمدرد کسی وید یا ڈاکٹر کا نام لیتا ہے۔ تو وہ منہ پھیر لیتے ہیں۔ انہیں اپنی موت کا کامل یقین ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب انہیں اپنی بیماری کے ذکر سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ اپنی حالت کا احساس اتنا ساری ہو گیا ہے۔ کہ پرسش حال بھی ان کے زخم پر نمک ہو جاتی ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھول جانا چاہتے ہیں کہ میں موت کے آغوش میں ہوں۔ ایک لمحہ کے لئے اس بارِ گراں کو سر سے پھینک کر آزادی سے سانس لینے کو ان کی طبیعت بیقرار ہو جاتی ہے۔ انہیں سیاسیات سے ہمیشہ نفرت تھی۔ اپنے ذاتی معاملات انہیں مصروف رکھنے کے لئے کافی تھے لیکن اب انہیں ملکی حالات سے خاص دلچسپی ہو گئی ہے۔ نہیں اپنی بیماری کے ذکر کے علاوہ وہ ہر ایک بات کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ مگر جوں ہی کسی نے از راہ ہمدردی کسی دوا کا نام لیا۔ ان کے تیور بدل جاتے ہیں۔ تاریکی میں صدائے درد اتنی خوش آیند نہیں ہوتی جتنی روشنی کی ایک جھلک۔

وہ مستقل مزاج آدمی تھے۔ سزا و جزا۔ عذاب و ثواب کے مسئلے ان کے ہر دائرہ

فکر سے باہر تھے۔ یہاں تک کہ نامعلوم دہشت کا بھی ان پر غلبہ نہ تھا۔ آئندہ کے جانب سے وہ بالکل بے فکر تھے۔ مگر اس کا باعث ان کا ذہنی جمود نہ تھا۔ بلکہ فکر دنیا نے فکر عقبےٰ کی گنجائش نہ باقی رکھی تھی۔ ان کا کنبہ بہت مختصر تھا۔ بیوی تھی اور ایک خورد سال بچہ۔ مگر مزاج میں ریاست کی بُو تھی۔ اور حوصلہ فراخ۔ نفی اثبات پر غالب رہتی تھی۔ اس پہ اس طولانی اور لاعلاج مرض نے نفی پر کئی درجوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ میرے بعد ان بیکسوں کا کیا حشر ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی ان کے دل میں ایک ہیجان سا برپا ہو جاتا تھا۔ ان کا نباہ کیسے ہوگا؟ یہ کس کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے؟ کون ان کی خبر لے گا؟ آہ میں نے شادی کیوں کی؟ صاحب عیال کیوں بنا؟ کیا اسی لئے کہ یہ دنیا کے احسان بارہ کے دستِ نگر بنیں۔ کیا اپنے خاندان کی عزت و حُرمت کو یوں پامال ہونے دوں جس درگا داس کے دستِ کرم سے سارے شہر نے فیض اٹھایا۔ اُسی کی بہو اور پوتا در بدر ٹھوکریں کھاتے ہوں۔

ہائے کیا ہوگا؟ کوئی ہمدرد نہیں۔ گذران کی کوئی صورت نہیں چاروں طرف ہولناک بیابان ہے۔ کہیں برگ و باد نظر نہیں آتا۔ یہ بھولی نازنین۔ یہ گلفام بچہ، انہیں کس پر چھوڑوں۔

ہم وضعداری میں فرد تھے۔ ہم نے کسی کے سامنے سر نہ جھکایا کسی سے شرمندۂ احسان نہیں ہوئے۔ ہمیشہ سر اُٹھا کر چلے۔ اور اب یہ نوبت ہے کہ کفن کا بھی ٹھکانا نہیں۔

۲

آدھی رات گذر چکی تھی جیون داس کی یہ حالت آج بہت نازک تھی۔ بار بار غشی

طاری ہو جاتی۔ بار بار دل کی حرکت بند ہو جاتی۔ انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اب انجام قریب ہے کمرہ میں ایک لیمپ جل رہا تھا۔ ان کی چارپائی کے قریب ہی پربھا دتی اور اس کا بچہ ساتھ سوتے ہوئے تھے جیون داس نے در و دیوار پر مایوسانہ نگاہ ڈالی۔ جیسے کوئی گم گشتہ مسافر کسی مسکن کی تلاش میں ہو۔ چاروں طرف سے گھوم کر ان کی نگاہیں پربھا دتی کے چہرہ پر جم گئیں۔ آہ۔ یہ حسینہ چند لمحوں میں بیکس ہو جاتے گی۔ یہ بچہ چند منٹوں میں تییم ہو جاتے گا۔ یہی دونوں ہستیاں میری زندگی کی آرزوؤں کا مرکز تھیں۔ میں نے جو کچھ کیا انہیں کے لئے کیا! انہیں کے لئے میری زندگی وقف تھی! اور اب انہیں اس منجدھار میں چھوڑے جاتا ہوں۔ اس لئے کہ وہ گرداب بیکسی کا لقمہ بن جائیں ان خیالات نے ان کے دل کو مسوس لیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اُن آنکھوں میں کتنا درد تھا۔ کتنا جذبہ محبت کتنا جوشِ ایثار

دفعتاً ان کے خیالات نے پہلو بدلا۔ درد کی جگہ چہرہ پر عزم قوی کی جھلک نظر آئی۔ جیسے صاحب خانہ کی جھڑکیاں سن کر کسی درویش سائل کے تیور بدل جاتے ہیں نہیں۔ ہرگز نہیں میں اپنے لختِ جگر کو اپنی پیاری بیوی کو تقدیر کا ستم بردار نہ بننے دونگا۔ میں اپنے خاندان کی عزت و ناموس کو یوں برباد نہ ہونے دوں گا۔ میں نیم جاں ہوں خستہ حال ہوں۔ لب مرگ ہوں لیکن تقدیر کے سامنے سر نہ جھکاؤں گا۔ اس کا محکوم نہیں۔ حاکم بنوں گا۔ اُس کی آستانہ بوسی نہ کروں گا۔ اسے اپنے پیروں پر جھکاؤں گا۔ اپنی کشتی کو عناصر کا پابوس نہ بننے دونگا۔

بیشک دنیا میرے اس فعل پر منہ بناتے گی۔ مجھے قاتل۔ سفاک کہے گی۔ اس لئے کہ اس کی شیطانی دلچسپیوں میں اس کے خون آشام تفریحات میں ایک مد کم ہو

جائے گی کیا مضائقہ، مجھے یہ اطمینان تو رہے گا۔ کہ دنیا کی ستم اندیشیاں مجھے کوئی گزند نہیں پہنچا سکیں ہیں اس کی جفا شعاریوں سے آزاد ہوں۔

جیون داس کے چہرہ پر عزم زرد نمودار تھا۔ وہ عزم جو خودکشی کا پیش خیمہ ہے وہ چارپائی سے اُٹھے۔ مگر ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپ رہے تھے۔ کمرہ کی ہر ایک چیز ان کیطرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ انہیں الماری کے شیشے میں اپنا عکس نظر آیا۔ چونک پڑے۔ یہ کون۔ مگر خیال آیا کہ یہ تو اپنا ہی سایہ ہے۔ انہوں نے الماری سے ایک چمچہ اور پیالہ نکالا۔ پیالے میں وہ زہریلی دوا تھی۔ جو ڈاکٹر نے ان کے سینے پر مالش کرنے کے لئے دی تھی۔ پیالے کو مضبوط پکڑے۔ چاروں طرف سہمی ہوئی نگاہوں سے تاکتے ہوئے، وہ پربھاوتی کے سرہانے آکر کھڑے ہو گئے۔ دل پر رقت کا غلبہ ہوا۔ ہائے ستم! ان پیاروں کو کیا میرے ہی ہاتھوں مرنا لکھا تھا۔ میں ہی ان کا دیو اجل بنوں گا۔ یہ اپنے ہی کردار کی سزا ہے۔ میں نے کیوں آنکھیں بند کر کے تاہل کی زنجیر گلے میں ڈالی۔ ان آنے والے حوادث کی طرف میرا خیال کیوں نہ گیا؟ میں اس وقت ایسا شاداں وخنداں تھا۔ گویا زندگی کا ایک نغمہ قائم ہے۔ ایک گلشن بے خار۔ یہ انہیں ناقابل اندیشیوں کی، اسی انجام بینی کی سزا ہے۔ کہ آج میں یہ روز سیاہ دیکھ رہا ہوں۔

دفعتاً انہیں اپنے پیروں میں لغزش معلوم ہوئی۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ نبض ساکت ہونے لگی۔ یہی دورۂ غشی کی علامتیں تھیں۔ وہ حسرتناک خیالات دل سے دُور ہو گئے۔ کون جانے یہی دورہ پیغام مرگ ہو! وہ تیزی سے سنبھل کر اُٹھے۔ اور پیالے سے دوا کا ایک چمچہ نکال کر پربھاوتی کے منہ میں ڈال دیا۔ اس نے نیند میں دو ایک بار منہ چلایا کروٹ بدل لی۔ تب انہوں نے لکھن داس کا منہ کھول کر اس میں

بھی دوا کا ایک چمچہ ڈال دیا۔ اور تب پیالہ کو زمین پر ٹپک دیا۔ ان کے پیروں کی لغزش غائب ہوگئی۔ بیہوشی کی سب علامتیں دُور ہوگئیں۔ دل و دماغ پر ایک ہراس کا غلبہ ہوا۔ وہ کمرہ میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھیر سکے۔ افشاءِ فعل کا خوف اقدامِ فعل سے بھی زیادہ ہوس ربا تھا۔ خوفِ پاداش نہ تھا۔ بلکہ ایک ہنگامہ ناخوشگوار سے بچنے کی خواہش۔ شماتت ہمسایہ کا نشانہ نہ بننا چاہتے تھے۔ مگر افسوس اُنہیں یہ معلوم تھا۔ کہ تقدیر یہاں بھی ان کے ساتھ نرد دغا کھیل رہی ہے جس دوا کو انہوں نے کو زہر سمجھا تھا۔ وہ دراصل وہ ٹانک تھا جو ڈاکٹر نے انہیں تقویت دل کے لئے دیا تھا۔ وہ گھر سے اس طرح باہر نکلے۔ جیسے کسی نے انہیں دھکیل دیا ہو۔ وہ کبھی اتنے چاق و چست نہ تھے۔ مکان لب راہ تھا۔ دروازہ پر ایک ٹانگہ ملا۔ وہ اس پر اُچھل کر جا بیٹھے۔ اعضا میں برقی رو دوڑ رہی تھی۔

ٹانگے والے نے پوچھا۔ کہاں چلوں؟

جہاں چاہو۔

اسٹیشن پر چلوں۔

وہیں سہی۔

چھوٹی لائن چلوں یا بڑی لین۔

جہاں گاڑی جلد مل جائے۔

ٹانگے والے نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ پہچانتا تھا۔ بولا۔ کیا آپکی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ کیا اور کوئی ساتھ نہ جائیگا؟

نہیں میں اکیلا ہی جاؤنگا۔

آپ کہاں جانا چاہتے ہیں ؟

بہت باتیں نہ کرو۔ یہاں سے فوراً چلو۔

ٹانگے والے نے گھوڑے کو چابک لگایا۔ اور ریلوے سٹیشن کی طرف چلا جیون داس وہاں پہنچتے ہی ٹانگہ سے کود پڑے۔ اور اسٹیشن کی طرف دوڑے۔ ٹانگہ والے نے کہا۔ پیسے ؟

جیون داس کو اب یاد آیا۔ کہ میں گھر سے کچھ لے کر چلا نہیں۔ یہاں تک کہ جسم پر کپڑے بھی نہ تھے۔ بولے پیسے پھر ملیں گے ۔

آپ نہ جانیں کب لوٹیں گے ۔

میرا جوتا نیا ہے ۔ لے لو۔

ٹانگہ والا کی جرأت اور بھی بڑھی سمجھا انہوں نے ضرور شراب پی لی ہے۔ اپنے آپے میں نہیں ہیں۔ چھکے سے جوتے لئے اور چلتا ہوا۔

گاڑی کے آنے میں ابھی گھنٹوں کی دیر تھی جیون داس پلیٹ فارم پر جا کر ٹہلنے لگے رفتہ رفتہ ان کے قدم تیز ہونے لگے۔ گویا وہ کسی کے تعاقب سے بچنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس کی مطلق فکر نہ تھی۔ کہ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ جاڑے کے دن تھے۔ لوگ سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے۔ مگر انہیں اوڑھنے بستر ے کا بھی خیال نہ تھا۔ ان کی قوتِ ادراک زائل ہو چکی تھی۔ صرف اپنے کردار کا احساس زندہ تھا۔ ایسا گمان ہوتا تھا کہ پربھاوتی میرے پیچھے دوڑی چلی آتی ہے۔ کبھی معلوم ہوتا کہ لکھن داس بھاگتا ہوا آ رہا ہے۔ کبھی پڑوسیوں کی صدائے گیرو دار کانوں میں آتی۔ لمحہ بہ لمحہ واہمہ مشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مال کے بوروں کے ڈھیر میں جا چھپے۔ ایک ایک منٹ پر چونک

پڑتے تھے اور پُر وحشت نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر پھر چھپ جاتے تھے۔ انہیں اب یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں یہاں کیا کرنے آیا ہوں۔ صرف ایک تحفظ جان کا حس باقی تھا گھنٹیاں بجیں جوق جوق مسافر آنے لگے۔ قلیوں کی ہم ہمہ۔ مسافروں کی چیخ و پکار آنے جانے والوں انجنوں کی دھک دھک۔ گھنٹیوں کی صدائے برخیز نے ایک قیامت برپا کر دی مگر جیون داس بے جان تودوں کے درمیان اس طرح پینترے بدل رہے تھے۔ گویا وہ انہیں گھیر کر گرفتار کرنا چاہتے ہوں۔

آخر گاڑی اسٹیشن پر آکر کھڑی ہو گئی۔ جیون داس سنبھل گئے۔ حافظہ عود کر آیا۔ وہ لپک کر بوروں کے نرغہ سے نکلے اور گاڑی پر جا بیٹھے۔

اتنے میں گاڑی کے دروازہ پر کھٹ کھٹ کی آواز آئی جیون داس نے چونک کر دیکھا ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ ان کی از خود رفتگی غائب ہو گئی۔ خطرہ کا وجود بازیافت کا منتر ثابت ہوا۔ وہ کونسا نشہ ہے جو مار کے آگے ہرن نہ ہو جاتے۔ ضرر کا اندیشہ اوسان کو بیدار کر دیتا ہے۔ انہوں نے پھرتی سے غسل خانہ کا دروازہ کھولا۔ اور جا کر ایک کونے میں دبک گئے ٹکٹ چیکر نے پوچھا۔ اور کوئی باقی تو نہیں ہے۔ مسافروں نے جیون داس کو غسل خانہ میں جاتے دیکھا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ انکے پاس ٹکٹ نہیں ہے لیکن سب نے یک زبان ہو کر کہا۔ اب کوئی باقی نہیں ہے۔ عوام کو اہل اختیار سے ایک ازلی کد ہوتی ہے۔

گاڑی چلی تو جیون داس باہر نکلے۔ مسافروں نے ایک قہقہہ سے ان کا خیر مقدم کیا۔ یہ ڈیڑھ دو میل تھا۔

۴

راستہ بھر جیون داس کو تصوّرات سے نجات نہ ملی۔ ہردوار پہنچ کر وہ ہیجان بہت کچھ فرد ہو چکا تھا۔ عناصر کی حقیقت کا احساس ہوُا۔ سردی سے پہلے ہی انجماد کی حالت طاری تھی۔ اب بھوک کی آگ نے جلانا شروع کیا۔ احسان کے کچے دھاگے کو وہ طوقِ آہنی سمجھتے تھے۔ مگر احتیاج کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ سدابرت میں جاکر کھانا کھایا۔ اور وہیں سے ایک کمبل بھی لائے۔

اسی طرح کئی دن گذر گئے۔ مگر موت کا تو ذکر ہی کیا۔ اب اُن عوارض میں بھی افاقہ نظر آتا تھا۔ جنہوں نے زندگی سے مایوس کر رکھا تھا۔ انہیں اپنے جسم میں روز بروز توانائی کا احساس ہونے لگا۔ چہرہ کی زردی مٹنے لگی۔ اشتہا نے بھی فطری حالت اختیار کی۔ غلبہ اخلاط توازن پر آیا۔ گویا دو عزیز جانوں کے صدقے نے موت کو رام کر لیا تھا۔

جیون داس کو یہ روز افزوں اصلاح اُن مہلک دردوں سے بھی جاں گداز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اب موت کو بلاتے۔ دعا کرتے۔ کہ وہ مہلک علامتیں پھر نمودار ہوں۔ ہر ایک قسم کی بدپرہیزی اور بے احتیاطی کرتے لیکن بے سُود۔ اُن صدموں نے موت کو فی الواقع رام کر لیا تھا۔

اب انہیں اندیشہ ہوُا۔ کہ میں سچ مچ زندہ رہونگا۔ آثار ایسے ہی نظر آتے تھے۔ روز بروز اُس کا یقین ہوتا تھا۔ انہوں نے تقدیر کو اپنے سر پر جھکانا چاہا تھا۔ مگر اب اپنے تئیں اس کے پیروں کے نیچے پڑا ہوُا پاتے تھے۔ انہیں بار بار اپنے اوپر غصہ آتا۔ کبھی کبھی بیتاب ہو کر اُٹھتے کہ زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ تقدیر کو

دکھادوں کہ میں اب بھی اُسے کچل سکتا ہوں لیکن اس کے ہاتھوں اتنی بڑی شکست پاکر انہیں خوف ہوتا تھا کہ کہیں اس سے بھی بدتر کوئی صورت نہ پیدا ہو جائے۔ اس کی طاقت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا۔

ان خیالات نے ان کے دل میں فلسفیانہ شکوک پیدا کرنے شروع کئے۔ مادی تعلیم نے انہیں پہلے ہی بدیہہ پرست بنا دیا تھا۔ اب انہیں سارا نظام عالم پرفریب اور سفاک نظر آنے لگے۔ یہاں انصاف نہیں۔ رحم نہیں۔ ہمدردی نہیں، غیر ممکن ہے کہ یہ نظام کسی ذات کریم کے مطیع ہو۔ اور اس کے علم میں ایسی بدعتیں ایسی ایسی جفاشعاریاں ایسی ایسی کرشمہ سازیاں وقوع میں آئیں۔ وہ نہ رحیم ہے نہ کریم۔ وہ علیم و خبیر بھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً وہ ذات شریر، خبیث، کج رو اور ستم شعار ہے۔ اہل دنیا نے اس کی قوتِ شر سے خائف ہو کر ازراہِ تملق اسے صفاتِ حسنہ کا منبع، تقدس اور جلال کا سرچشمہ، خیر اور برکت کا ماخذ بنا دیا ہے۔ یہ بکیسانہ اور عاجزانہ ہرزہ رسائی ہے۔ اپنی خاکساری کا خالص اعتراف۔ اس بے دست و پائی کو عبادت کہتے ہیں۔ اور اُن پر ناز کرتے ہیں۔ اہل فلسفہ فرماتے ہیں۔ یہ ساری کائنات اٹل قوانین کے تابع ہے۔ ان کا عمل ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی ان کی سہل اعتقادی قوانین بےحس۔ جامد اور نابین ہوتے ہیں۔ ان میں ستمگاری کا سلیقہ نہیں۔ انہیں ایذا رسانی سے غرض نہیں وہ اگر کسی کے دوست نہیں۔ تو کسی کے دشمن بھی نہیں۔ ان قوانین کا محرک اس شعبدہ کا کوئی ذاری ضرور ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ مگر وہ قوتِ غیب فرشتہ نہیں، انسان نہیں شیطان ہے۔

ان خیالات اور شکوک نے رفتہ رفتہ عمل کے دائرہ میں قدم رکھا۔ طاعت خیر

ہیں رفعت کی جانب مائل کرتی ہے۔ اطاعت نا خیر پرستی کی طرف جیون داس کی کشتی کا لنگر ثبات اکھڑ گیا۔ اب اسے نہ سکون تھا نہ قرار۔ لہروں کے تلاطم سے زیر و زبر ہوتی رہتی تھی۔

۴

پندرہ سال گذر گئے۔ جیون داس اب امیرانہ شان و شکوہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ عالیشان مکان تھا۔ سواریاں تھیں۔ خدام تھے۔ آئے دن عیش و طرب کی مجلس ہوتی تھیں۔ اب نفس پروری ان کا ایمان تھا۔ خود پرستی ان کا دین، ضمیر اور اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے تھے جسن و خطا کا احساس فنا ہو گیا تھا۔ وسائل کی بھی کمی نہ تھی۔ سرقہ، مذہب، کذب مکلف، افترا محجوب، تحریف رو پوش تلبیس بانقاب اتنے آقاؤں کے غلام کو کس بات کی کمی۔ وہاں صرف ظاہری وقار کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور کسی قدر سختی سے اس دائرہ کے سوا سمند نفس کی خوش خرامیوں کے لئے اور کوئی سدِ راہ نہ تھا۔ ندیم و مجلیس بھی اسی قماش کے تھے۔ کوئی یک فن تا در کوئی ہر فن مولا۔

جیون داس کو اب اپنے بیوی بچوں کا غم نہ ستاتا تھا۔ ماضی اور مستقبل دونوں مٹ گئے تھے۔ صرف حال پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔ وہ ثواب کو عذاب سمجھتے تھے اور عذاب کو ثواب۔ انھیں نظامِ دنیا کا یہی بنیادی اصول نظر آتا تھا۔ اور وہ خود اس معکوس خیال کی زندہ مثال تھے۔ ضمیر کی گرہوں کو توڑ کر وہ جنبی رفعت پر پہونچے وہاں تک ضمیر کے قفس میں پڑے ہوئے۔ شاید ان کی نگاہ بھی نہ پہونچتی۔ گرد و پیش کی مثالیں اس انحراف کی موید تھیں۔ شعبدہ اور ریا کی قوت فیصلہ کن نظر آتی تھی۔

یہی حیات موفور کا راز تھا۔ آزاد اڑتے تھے۔ پابند ایڑیاں رگڑتے تھے۔ تجارت اور سیاست کی شبستان، علم وسخن کا مسند، سلوک وصفا کے دائرے، خلوص اتحاد کی مجلسیں سب اسی شمع سے منور نظر آتی تھیں۔ ایسی دیوی کی اُپاسنا کیوں نہ کی جاتے۔

گرمی کے دن تھے۔ شام کا وقت، ہردوار کے ریلوے سٹیشن پر جاتریوں کا ہجوم تھا۔ اور جیون داس ایک گیروے رنگ کی ریشمی چادر گلے میں ڈالے، سنہری عینک لگاتے۔ زہد واتقا کی زندہ مورت بنے ہوتے اپنے دوستوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ ان کی نافذ نگاہیں جاتریوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دفعتہً انہیں دوسرے درجہ کے کمرے میں ایک شکار نظر آیا۔ یہ ایک شکیل خوش وضع نوجوان تھا۔ بشرہ سے امارت ٹپک رہی تھی گھڑی کی زنجیر طلائی تھی۔ تنزیب کی اچکن میں سونے کے بٹن۔ سامانِ سفر بھی پُرتکلف۔ دو خدمتگار ساتھ تھے جس طرح قصاب کی نگاہ جانور کے گوشت وپوست پر رہتی ہے۔ اسی طرح جیون داس کی نگاہ میں انسان ایک جنس نصرت تھا۔ اس کے قیافہ نے حیرت انگیز مہارت بہم پہنچالی تھی۔ اس سے کبھی سہو نہ ہوتا تھا۔ یہ نوجوان ضرور کوئی رئیس زادہ ہے اور سادہ لوح، مغرور بھی ہے۔ اس لئے آسانی سے دام میں آجائیگا۔ صرف تالیف ہی کافی ہے۔ ذکی اور طباع ہے۔ اس کی تالیف کے لئے شعبدہ بازی کی ضرورت ہے۔ اس پر اپنے عارفانہ کمال کا سکہ بٹھانا چاہئے۔ اس کے حسنِ عقیدت پر نشانا مارنا چاہئے۔ میں پیر بنوں۔ یہ دونوں رفیق مرید بن جائیں۔ پریدان اور پرانیدان کی گھاتیں چلیں۔ تزویر کی چوٹیں پڑیں۔ میرے تبحر اور معرفت خوارق ومعجزات، بے لوثی اور نادنیا طلبی، پر گوہر فشانیاں کی جائیں۔ مجھے مافوق البشر بتایا جاوے تعریفوں

کے پُل باندھ رکھے جائیں۔ فصاحت اور بلاغت کے انبار لگا دیئے جاویں اور طائر کے سامنے دانہ بکھیر کر اس پر جال ڈال دیا جائے۔

یہ فیصلہ کرکے جیون داس اپنے دونوں گرگوں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہوئے نوجوان نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ گویا اپنے کسی از یاد رفتہ دوست کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفعتہً بے صبرانہ انداز سے بولا۔

مہاتما جی آپ کا استھان کہاں ہے ؟

جیون داس دل میں باغ باغ ہوگئے۔ بولے بابا سنتوں کا استھان کیا۔ سارا سنسار ہمارا استھان ہے۔

نوجوان نے پھر پوچھا۔ آپ کا نام لالہ جیون داس تو نہیں ہے ؟

جیون داس چونک پڑے۔ سینہ بلیوں اچھلنے لگا۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ کہیں خفیہ پولیس کا کوئی افسر تو نہیں ہے ۔ نوجوان کے چہرہ کی طرف تجسس کی نگاہ سے دیکھا اقرار کروں یا انکار۔ اس کا فیصلہ نہ کر سکے۔ دونوں صورتیں خطرناک تھیں۔ گم سم سے ہوگئے۔

نوجوان نے انہیں حیص بیص میں دیکھ کر کہا۔ مہاراج میری اس بے ادبی کو معاف فرمایئے گا۔ یہ پوچھنے کی جرأت صرف اس لئے کی ہے کہ آپ کی صورت میرے پتا جی سے بہت ملتی ہے جو عرصہ دراز سے لاپتہ ہیں۔ لوگ کہتے ہیں سنیاسی ہوگئے برسوں سے انہیں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔

جس طرح اُفق پر طوفان کی موجیں چڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور طرفۃ العین میں آسمان پر محیط ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جیون داس کو اپنے دل میں رقت کی ایک

لہر سی اُٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گلا پھنس گیا۔ اور نظروں میں ہر ایک چیز تیرتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ انہوں نے نوجوان کی طرف چھپی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ مغائرت کا پردہ ہٹ گیا۔ اُس کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور بولے "لکھو"۔

لکھن داس ان کے پیروں گر پڑا۔ اور بولا "لالہ جی"۔

میں نے بالکل نہیں پہچانا۔

مدتیں گذر گئیں۔

۵

آدھی رات سے زیادہ گذر چکی تھی۔ لکھن داس سو رہا تھا۔ اور جیون داس کھڑکی سے باہر سر نکالے خیالات میں غرق تھے۔ مشیت کا نیا کرشمہ پیش نظر تھا۔ وہ عقائد جو مدت دراز سے ان کے مشعل ہدایت بنے ہوئے تھے۔ متزلزل ہو گئے تھے۔ میں اپنی نخوت کے زعم میں کتنا از خود رفتہ ہو گیا تھا۔ سمجھتا تھا۔ میں ہی نظام دنیا کا سررشتہ دار ہوں۔ میں ہی قضا کا داروغہ ہوں۔ رزق کی کنجی میرے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اپنی موت پر پسماندوں کی ذلت اور خرابی کو یقین سمجھتا تھا۔ میرا یہ زعم کتنا باطل ثابت ہوا۔ جنہیں میں نے زہر دینے میں دریغ نہ کیا۔ وہ آج زندہ ہیں۔ خوش و خورم ہیں۔ صاحب ثروت ہیں۔ غیر ممکن تھا کہ میں لکھو کو ایسی اعلےٰ تعلیم دے سکتا۔ اس کا اخلاقی نشو ونما بھی اتنے خوبی سے مجھ سے انجام نہ ہو سکتا تھا۔ اور اسے اتنی اونچی حیثیت پر پہونچانے کا تو میں کبھی خواب میں گمان نہ کر سکتا تھا۔ سمجھتا تھا۔ وہ میرے مرتے ہی خستہ و خوار ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس میری گمشدگی ان کے حق میں کیمیا ہو گئی۔ کتنا خلیق۔ خوش کلام، خندہ رُو۔ بے لوث نوجوان ہے۔ کتنا منکسر، کتنا موقع شناس، مجھے تو اب اُس کے ساتھ بیٹھنے میں بھی

اپنی پستی کا احساس ہوتا ہے۔ مجھ جیسا سیہ کار۔ کور باطن، نفس پرور انسان اتنا خوش نصیب ہوا۔ افسوس میری خود بینی میرے لئے غار سیاہ بن گئی۔

جس کی تہ میں پڑا ہوا میں تاریکی کے جانداروں سے بھی زیادہ ناپاک اور مکروہ ہوں میں نظام عالم کو کسی شیطانی طاقت کا مطیع سمجھتا تھا۔ جو اہل دنیا کے ساتھ گربہ موش کا تماشہ کرتی ہے۔ کیسی جہالت تھی۔ آج مجھ جیسا آشیاں برباد دنیا کے خوش نصیب ترین آدمیوں میں ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس کا منتظم مصدر فیوض و برکات ہے۔ ورنہ میں ان عطاہائے بیکراں کے قابل کب تھا۔ صبح ہوتے ہوتے مجھے اس دیوی کے درشن ہونگے جس کے ساتھ میری زندگی کے بہترین ایام گذرے ہیں۔ میرے پوتے اور پوتیاں میری گود میں کھیلیں گے۔ عزیز و احباب میرا خیر مقدم کرینگے۔ مجھے مبارکباد دینگے۔ ایسے برکت پاش خیرالوجود کو میں مایہ شر سمجھتا تھا۔

انہیں خیالات میں جیون داس کو نیند آگئی جب آنکھیں کھلیں تو لکھنؤ کی مانوس اور شیریں صدا کانوں میں آئی۔ وہ چونک کر اٹھ بیٹھے۔ لکھن داس اسباب اتروا رہے تھے۔ اسٹیشن سے باہر ان کی فٹن کھڑی تھی۔ دونوں آدمی اس پر بیٹھے جیون داس کا دل ہجوم مسرت سے بیٹھا جاتا تھا۔ ان کے چہرہ پر خوشی کی پژمردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھے تھے۔ گویا دنیا کی مطلق خبر نہیں ہے۔ گویا کوئی حس بھی نہیں۔ کیا سیلاب مراد بھی اب نیستاں کی کثرت ہے۔ جو کشت زار دل کو ڈبا دیتی ہے۔

فٹن روانہ ہوئی۔ جیون داس کو ہر ایک چیز نئی معلوم ہوتی تھی۔ نہ وہ مکانات تھے۔ نہ وہ بازار۔ نہ وہ گلی کوچے۔ نہ وہ انسان، ایک انقلاب سا ہو گیا تھا۔ دفعتہً انہیں ایک صاف ستھرا خوشنما بنگلہ نظر آیا جس کے پھاٹک پر جلی حروف میں منقوش

جیون داس پاٹ شالا" جیون داس بولے یہ کیا ہے۔

لکھن داس نے کہا۔ اماں جان نے آپ کی یادگار میں یہ پاٹ شالا کھولی ہے۔ اس میں مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ اور کئی لڑکے وظیفے پاتے ہیں۔

جیون داس کا دل اور بھی بیٹھ گیا۔ منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔

ایک لمحہ اور گذرا۔ فٹن رک گئی۔ لکھن داس اتر پڑے۔ جیون داس نے دیکھا تو ایک عالیشان پختہ عمارت تھی۔ ان کے پرانے کھپریل والے پیارے گھر کا کوئی نشان نہ تھا۔ صرف ایک نیم کا درخت اس کی یادگار رہ گئی تھی۔ کئی نوکروں نے دوڑ کر اسباب اتارا۔ دو کلغدار بچے۔ بابوجی، بابوجی، پکارتے ہوتے دوڑے اور لکھن داس کے پیروں سے چمٹ گئے۔ سارے گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ محلہ کے لوگ مزاج پرسی کے لئے آنے لگے۔ دیوان خانہ کھل گیا۔ جو تکلفات سے آراستہ تھا۔ جیون داس ایسے گم گشتہ ہو رہے تھے۔ گویا یہ کوئی نیرنگ ہے۔

۶

آدھی رات گذر چکی ہے۔ جیون داس کو کسی کروٹ نیند نہ آتی تھی۔ اپنی عمر گزشتہ کا نقشہ ان کے پیش نظر تھا۔ ان پندرہ سالوں میں انہوں نے جو کانٹے بوتے تھے۔ وہ اس وقت انہیں جگر میں چبھ رہے تھے۔ جو غار کھودے تھے وہ اس وقت انہیں نگلنے کے لئے منہ کھولے ہوتے تھے۔ ایک ہی دن میں ان کی حالت متغیر ہو گئی تھی۔ بے اعتقادی کی جگہ دست غیب کا اعتقاد دل پر حاوی ہو گیا تھا۔ اور یہ اعتقاد محض ذہنی نہیں۔ بلکہ غیبی تھا۔ مشیت غیب کا خوف ایک دیو سیاہ کی صورت میں ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس سے اب انہیں کوئی مفر نظر نہ آتا تھا۔ اب تک ان کی ذات وہ

آگ کی بے ضرر چنگاری تھی جو کسی ریگ زار میں پڑی ہو۔ لیکن آج وہ چنگاری ایک خرمن کے دامن میں پڑی ہوتی تھی معلوم نہیں وہ کب مشتعل ہو کر خرمن کو خاک سیاہ کر دے

جوں جوں رات گذرتی جاتی تھی۔ یہ دہشت ندامت کی صورت اختیار کرتی تھی میں اس قابل نہیں کہ اس مجسم رحم و عفو کو اپنا روئے سیاہ دکھاؤں۔ اُس نے مجھے ہمیشہ اپنے رحم و کرم کے سایہ میں رکھا۔ اور یہ مبارک دن دکھایا میری تیسہ روئی انہیں کے رحم و کرم پر ایک داغ سیاہ ہے میں ننگ وجود اس رحیمی کے صدقہ کے قابل بھی نہیں۔

کیا میں اس وجود پاک کی نظروں میں حقیر ہوں ؟ کیا میری سیہ کاری میرے خاندان کو ملوث۔ میری طوفان انگیزیاں اس بہار کو ملیا میٹ نہ کر دینگی۔

آہ ! اسی خاندان کے ننگ و نام کی حفاظت کے لئے اس کا وقار قائم رکھنے کے لئے میں جلاد بنا تھا۔ کیا اب میں خود ننگِ خاندان کہلاؤں ؟ اپنے اعمال کی بنا ہی سے اس کے روشن کارنامے کو سیاہ کر دوں ؟ اپنی زندگی سے وہ ستم برپا کر دوں اور قہر ڈھاؤں جو موت کبھی نہ کر سکتی تھی۔ میرے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ پرماتما وہ خون رنگ نہ لائے۔ یہ دل گناہوں کے جرائم سے متعفن ہو رہا ہے۔ پرماتما یہ خاندان انکے متعدی اثر سے مامون رہے۔

ان تصورات نے جیون داس کے جذبہ ندامت اور خوف کو اس حد تک متحرک کیا کہ وہ متوحش ہو گئے جس طرح پرتی زمین میں بیج غیر معمولی نشوو نما پاتا ہے۔ اسی طرح اعتقاد سے خالی دل میں جب اعتقاد جاگزین ہوتا ہے تو اس میں حیرت انگیز صداقت اور ہدایت ہوتی ہے۔ اس میں علم کی بجائے عمل کا پہلو غالب ہوتا ہے سرفروشانہ جوش اس کی خاص صفت ہوتی ہے۔ جیون داس کو اپنے چاروں طرف

ایک وجود محیط، ایک دستِ غیب، ایک نگاہ سازی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور یہ حسیات لمحہ بہ لمحہ تیز اور روشن ہوتی جاتی تھیں۔ اپنی پُر آشوب زندگی کی واردات لپکتے ہوئے شعلے بن بن کر اُس گھر کی طرف، اس امن و خوشی کے جلوہ گاہ کی طرف دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا کہ وہ اسے نگل جائیں گے۔

مشرق کی طرف صبح کی تنویر نظر آنے لگی تھی۔ جیون داس گھر سے نکلے۔ انہوں نے اپنے وجود نحس کو فنا کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اپنے گناہوں کی آنچ سے اپنے خاندان کو بچانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اپنی ہستی کو مٹا کر اپنی ندامت کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا

آفتاب پردہ افق سے باہر نکلا۔ اسی وقت جیون داس گومتی کی لہروں میں سما گئے۔

دعوتِ شیراز

اشخاص

دیاشنکر۔ دفتر کے ایک معمولی کلرک۔
آنندموہن۔ کالج کا ایک طالب علم اور دیاشنکر کا دوست
جوتی سروپ۔ دیاشنکر کا ایک دور کی رشتہ دار
سیوتی۔ دیاشنکر کی بیوی۔

(ہولی کا دن)

(وقت ۹ بجے رات۔ آنندموہن اور دیاشنکر باتیں کرتے جا رہے ہیں)

آنندموہن۔ ہم لوگوں کو دیر تو نہیں ہوتی۔ ابھی نو بجے ہونگے۔

دیاشنکر۔ نہیں ابھی کیا دیر ہوگی۔

آنند۔ وہاں بہت انتظار نہ کرانا۔ ایک تو دن بھر کی کوچہ گردی کے بعد مجھ میں انتظار کی قوت نہ رہی۔ اور پھر گیارہ بجے بورڈنگ ہاؤس کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

دیاشنکر۔ ابھی چلتے چلتے تھالی سامنے آئے گی۔ میں نے سیوتی سے کہہ دیا تھا

نو بجے تک سب سامان تیار رکھنا۔

آنند موہن۔ تمہارا مکان دُور ہے یا میرے پیروں کی طاقت سلب ہوگئی ہے بات کرتے چلیں۔ پردے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ بھابی جان میرے سامنے آئیں گی یا نہیں۔ اُن کے رخِ روشن کا دیدار کر سکونگا؟

دیا شنکر۔ تمہارے اور میرے درمیان برادرانہ بے تکلفی ہے۔ سیوتی اگر بے حجاب آئے تو مضائقہ نہیں لیکن عام طور پر میں پردے کے رواج کی پُرزور حمایت کرتا ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے اطوار و آداب بھی اتنے پاکیزہ نہیں ہوئے ہیں کہ کوئی عورت اپنی شرم کی حسن کو صدمہ پہنچائے بغیر گھر سے نکل سکے۔

آنند موہن۔ میرے خیال میں تو پردہ ہی سوقیانہ کنایات اور بے باکانہ اشارات کا محرک ہے۔ حجاب فطرتاً اشتیاق کو اکساتا ہے۔ اور وہ اشتیاق کبھی تو آہِ سرد اور کبھی چشم و ابرو کی حرکتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

دیا شنکر۔ جب تک ہم میں حفظِ عصمت کا اتنا جوش نہ ہو کہ اپنے تئیں اس پر نثار نہ کر سکیں۔ اُس وقت تک پردے کو توڑنا میں سوسائٹی کے حق میں زہر قاتل سمجھتا ہوں۔

آنند موہن۔ آپ کے خیال میں یورپ میں حفظِ عصمت کے لئے شب و روز خون کی ندیاں بہتی رہتی ہیں۔

دیا شنکر۔ وہاں اس بے پردگی نے عصمت کے معیار کو بہت پست کر دیا ہے ابھی میں نے کسی اخبار میں دیکھا۔ ایک عورت نے کسی مرد کے اوپر عدالت میں اس بنا پر استغاثہ کیا تھا۔ کہ اس نے بے باکانہ انداز سے گھورا تھا۔ حاکمِ عدالت

نے عورت کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور یہ کہہ کر استغاثہ خارج کر دیا کہ ہر ایک حسین عورت کو بازار میں گھورے جانے کے لئے تیار رہنا چاہئے ہیں تو اس استغاثہ اور اس فیصلہ دونوں ہی کو مضحک اور شرمناک سمجھتا ہوں جو کسی مہذب قوم کے شایانِ شان نہیں۔

آنند موہن۔ اچھا اس تذکرہ کو چھوڑو۔ یہ تبلاؤ۔ کہ اس وقت کیا کیا چیزیں کھلاؤ گے یار نہ سہی۔ ذکر یار ہی سہی۔

دیا شنکر۔ یہ تو سیوتی کے سلیقہ اور حسنِ مذاق پر منحصر ہے۔ پوریاں اور کچوریاں تو ہونگی اور غالباً خوب کھری ہوں گی۔ خستئے اور سموسے بھی لازمی طور پر آئیں گے۔ کھیر کے بارے میں بلا خوف پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ آلو اور گوبھی کی شوربہ دار ترکاری۔ بھنے ہوئے مٹر و الموٹ بھی ملیں گے۔ فیرنی کے لئے بھی کہہ آیا تھا۔ گولر کے کوفتے اور آلو کے کباب۔ یہ دونوں چیزیں سیوتی خوب پکاتی ہے۔ ان کے علاوہ دہی بڑے چٹنی۔ اچار کا ذکر تو گویا تحصیل حاصل ہے۔ ہاں شاید کشمش کا رائتہ بھی ملے جس میں زعفران کی خوشبو بھی اُڑ رہی ہوگی۔

آنند موہن۔ یار میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ ذکر یار نے پیروں میں جان ڈالدی کاش پر ہوتے تو اُڑ کر پہنچ جاتا۔

دیا شنکر۔ لو اب آتے جاتے ہیں۔ یہ تمباکو والے کی دوکان ہے۔ اس کے بعد چوتھا مکان میرا ہے۔

آنند موہن۔ میرے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی تھالی میں کھانا۔ ایسا نہ ہو مجھے بسیار خوری کیلئے بھابی جان کے سامنے نادم ہونا پڑے۔

دیا شنکر۔ اس سے تم مطمئن رہو۔ انہیں کم خور آدمیوں سے چڑھ ہے۔ کہتی ہیں۔ جو کھائیگا ہی نہیں وہ دُنیا میں کام کیا کریگا۔ آج شاید تمہاری بدولت مجھے بھی کام کرنے والوں کی صف میں جگہ مل جائے۔ کم از کم کوشش تو ایسی ہی کرنا۔

آنند موہن۔ بھی انتہائی کوشش کرونگا۔ شاید تمہیں جاتے صدر حاصل ہو جائے

دیا شنکر۔ یہ لو آگئے۔ دیکھنا زینہ پر اندھیرا ہے۔ شاید چراغ رکھنا بھول گئیں۔

آنند موہن۔ کوئی مضائقہ نہیں ظلمات میں ہی آبِ حیات ملتا ہے۔

دیا شنکر۔ فرق یہ ہے کہ ظلمات میں پیر پھسلے تو پانی میں گروگے یہاں پیر پھسلا تو سنگریزوں کی سڑک پر۔

(جوتی سروپ آتے ہیں)

جوتی سروپ۔ بندہ بھی حاضر ہو گیا۔ دیر تو نہیں ہوئی۔ ڈبل مارچ کرتا آیا ہوں۔

دیا شنکر۔ نہیں ابھی تو دیر نہیں ہوئی۔ بلکہ شاید آپ کا اشتیاق وقت پہلے کھینچ لایا۔

آنند موہن۔ آپ کی تعریف کیجیے۔ مجھے آپ سے نیاز نہیں حاصل ہے۔

دیا شنکر۔ (انگریزی میں) میرے ایک دُور کے رشتہ میں سالے ہوتے ہیں۔ ایک وکیل کے محرر ہیں۔ خواہ مخواہ کا ناتا جوڑے ہوتے ہیں۔ بیبوتی نے دعوت کی ہوگی۔ مجھے تو خبر بھی نہیں انگریزی نہیں جانتے۔

آنند موہن۔ اتنی خیریت ہے۔ انگریزی میں باتیں کرینگے۔

دیا شنکر۔ سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔ ناجنسوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا۔ پھوڑے کا اپریشن کرانے کے برابر ہے۔

آنند موہن۔ کسی ترکیب سے انہیں رخصت کرنا چاہئے۔
دیا شنکر۔ مجھے تو یہ غم ہے کہ اب دنیا کے کارگزاروں میں ہمارا اور تمہارا کہیں شمار بھی نہ ہوگا۔ پالا اسی کے ساتھ رہیگا۔
آنند موہن۔ خیر اوپر چلو۔ مزہ تو جب آئے کہ یہ حضرت نیم شکم اٹھنے پر مجبور ہوں۔
(تینوں آدمی اوپر جاتے ہیں۔)
دیا شنکر۔ ارے کمرہ میں بھی روشنی نہیں ہے۔ گھپ اندھیرا ہے۔ لالہ جوتی سروپ دیکھئے کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑیئے گا۔
آنند موہن۔ ارے غضب..... الماری سے ٹکرا کر دھم سے گر پڑتا ہے۔
دیا شنکر۔ لالہ جوتی سروپ۔ کیا آپ گرے۔ چوٹ تو نہیں آئی؟
آنند موہن۔ اجی بس گر پڑا۔ کمر ٹوٹ گئی۔ تم نے اچھی دعوت کی۔
دیا شنکر۔ مردِ خدا۔ سینکڑوں بار تو آئے ہو۔ معلوم نہیں تھا کہ سامنے الماری رکھی ہوئی ہے۔ کیا زیادہ چوٹ لگی؟
آنند موہن۔ جاؤ اندر۔ تھالیاں لاؤ۔ بھابی سے کہہ دینا۔ تھوڑا سا تیل گرم کر لیں۔ مالش کر لونگا۔
جوتی سروپ۔ جناب یہ آپ نے کیا رکھ چھوڑا ہے۔ زمین پر گر پڑا۔
دیا شنکر۔ اگالدان تو نہیں لڑھکا دیا ہے۔ ہاں وہی تو ہے۔ سارا فرش خراب ہوگیا۔
آنند موہن۔ بھائی جان جاکے لالٹین جلوا لاؤ۔ کہاں کال کوٹھری میں ڈال دیا ہے
دیا شنکر (گھر میں جاکر) ارے یہاں بھی اندھیرا ہے چراغ تک نہیں۔

سیوتی۔ کہاں ہو؟

سیوتی۔ بیٹھی ہوں۔

دیاشنکر۔ یہ بات کیا ہے۔ چراغ کیوں نہیں جلے طبیعت تو اچھی ہے؟

سیوتی۔ بہت اچھی ہے۔ بارے تم آتو گئے۔ میں نے تو سمجھا تھا۔ آج درشن ہی نہ ہونگے۔

دیاشنکر۔ بخار ہے کیا۔ کب سے آیا ہے؟

سیوتی۔ لرزہ بخار کچھ نہیں ہے۔ اچھی خاصی تو بیٹھی ہوں۔

دیاشنکر۔ تمہارا پرانا قولنج تو عود نہیں کر آیا۔

سیوتی (طنز سے) ہاں قولنج ہی تو ہے۔ لاؤ کوئی دوا ہے؟

دیاشنکر۔ ابھی ڈاکٹر کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

سیوتی۔ کوئی مفت کی رقم ہاتھ آگئی ہے کیا؟ لاؤ مجھے دیدو۔ اچھی ہو جاؤں۔

دیاشنکر۔ تم تو دل لگی کر رہی ہو۔ صاف صاف کوئی بات نہیں کہتیں کیا میرے دیر آنے کی سزا ہے۔ میں نے تو نو بجے آنے کا وعدہ کیا تھا شاید دو چار منٹ زیادہ ہوتے ہوں۔ چیزیں سب تیار ہیں۔ نا؟

سیوتی۔ ہاں بہت ہی خستہ۔ آدھوں آدھ مکھن ڈالا تھا۔

دیاشنکر۔ آنند موہن سے میں نے تمہاری خوب تعریف کی۔

سیوتی۔ ایشور نے چاہا تو وہ بھی تعریف ہی کریں گے۔ پانی رکھ آؤ۔ ہاتھ دھوئیں۔

دیاشنکر۔ چٹنیاں بھی بنوائی ہیں نہ؟ آنند موہن کو چٹنیوں سے بہت رغبت ہے

سیوتی۔ خوب چٹنی کھلاؤ۔ میروں بنا رکھی ہے۔

دیاشنکر۔ پانی میں کیوڑا ڈال دیا ہے؟

سیوتی۔ ہاں لے جاکر پانی رکھ آؤ۔ پینا شروع کریں۔ پیاس لگی ہوگی۔

آنند موہن۔ (باہر سے) یار جلد آؤ۔ اب انتظار کی تاب نہیں ہے۔

دیاشنکر۔ جلدی مچا رہا ہے۔ لاؤ تھالیاں پرسو۔

سیوتی۔ پہلے چٹنی اور پانی تو رکھ آؤ۔

دیاشنکر۔ (رسوئی میں جاکر) ارے! یہاں تو چولھا بالکل ٹھنڈا پڑا گیا ہے۔ مہری آج سویرے ہی کام کر گئی ہے کیا؟

سیوتی۔ ہاں کھانا پکنے سے پہلے ہی آ گئی تھی۔

دیاشنکر۔ برتن سب منجھے ہوئے رکھے ہیں۔ کیا کچھ پکا یا ہی نہیں؟

سیوتی۔ شیطان آکر کھا گئے ہوں گے۔

دیاشنکر۔ کیا چولھا ہی نہیں جلایا؟ غضب کر دیا۔

سیوتی۔ غضب میں نے کر دیا یا تم نے۔

دیاشنکر۔ میں نے تو سب سامان لاکر رکھ دیئے تھے۔ تم سے بار بار پوچھ لیا تھا کہ کسی چیز کی کمی ہو تو بتلا دو۔ پھر کھانا کیوں نہ پکا۔ یہ عجیب راز ہے۔ میں ان دونوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔

آنند موہن۔ یار کیا وہاں سب چیزیں اکیلے ہی چٹ کر رہے ہو۔ ادھر بھی لوگ منتظر بیٹھے ہیں۔ انتظار دم توڑ رہا ہے۔

سیوتی۔ سامان سب لاکر رکھ دیتے ہوتے تو مجھے بنانے میں عذر ہوتا؟

دیاشنکر۔ خیر اگر ایک دو چیزوں کی کمی ہی رہ گئی تھی۔ تو اس کے کیا معنی کہ چولھا ہی نہ جلے۔ یہ تو تم نے مجھے کسی خطا کی سزا دی ہے۔ آج ہولی کا دن اور یہاں آگ نہ جلی۔

سیوتی۔ جب تک ایسے چرکے نہ کھاؤ گے۔ تمہاری آنکھیں نہ کھلیں گی۔

دیاشنکر۔ تم تو معمول میں باتیں کر رہی ہو۔ آخر کس بات پر ناراض ہو۔ میں نے کیا خطا کی ہے۔ جب یہاں سے چلنے لگا ہوں۔ تو تم خوش تھیں۔ اس کے پہلے بھی میں نے تمہیں ناراض نہیں دیکھا۔ میری غیر حاضری میں ایسی کونسی بات ہو گئی کہ تم اتنی روٹھ گئیں

سیوتی۔ گھر میں عورتوں کو قید رکھنے کی یہی سزا ہے۔

دیاشنکر۔ اچھا تو یہ اس قصور کی سزا ہے۔ مگر تم نے مجھ سے کبھی پردہ کی شکایت نہیں کی۔ بلکہ جب کوئی بات آپڑتی تھی۔ تو تم میرے ہم خیال ہو جاتی تھیں۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ تمہیں پردہ سے اتنی دشمنی ہے۔ کیا دونوں مہمانوں سے یہی کہہ دوں کہ آج پردہ کی حمایت کی سزا میں میرے یہاں عزہ ہے۔ آپ لوگ ٹھنڈی ہوا کھائیے۔

سیوتی۔ جو چیزیں تیار ہیں وہ جا کر کھلا دو۔ جو نہیں ہیں انکے لئے معذرت کر لو۔

دیاشنکر۔ میں تو کوئی چیز تیار نہیں دیکھتا۔

سیوتی۔ ہے کیوں نہیں چٹنی بنا ہی ڈالی ہے۔ پانی بھی تیار ہے۔

دیاشنکر۔ یہ دل لگی تو ہو چکی سچ سچ بتاؤ۔ کھانا کیوں نہیں بنایا۔ طبیعت خدانخواستہ خراب ہو گئی تھی یا کسی کتے نے اوپر آ کر رسوئی ناپاک کر دی۔

آنندموہن۔ باہر کیوں نہیں آتے ہو بھئی۔ اندر ہی اندر کیا مسکوٹ کر رہے ہو اگر سب چیزیں تیار نہیں ہیں نہ سہی۔ جو کچھ تیار ہو وہی لاؤ۔ اس وقت تو سادی پوریاں بھی خستے سے زیادہ لذیذ معلوم ہونگی کچھ لاؤ۔ شرعات تو ہو۔ مجھ سے زیادہ بے قرار

میرے دوست منشی جوتی سروپ ہیں۔

سیوتی۔ بھیا تے دعوت کے انتظار میں آج دوپہر کو بھی کھانا نہ کھایا ہوگا۔

دیاشنکر۔ بات کیوں ٹالتی ہو میری باتوں کا جواب کیوں نہیں دیتیں۔

سیوتی۔ نہیں جواب دیتی۔ کچھ آپ کا قرض کھایا ہے۔ یا رسوئن بنانے کے لئے لونڈی ہوں۔

دیاشنکر۔ اگر میں گھر کا کام کر کے اپنے کو غلام نہیں سمجھتا۔ تو تم گھر کا کام کر کے اپنے کو لونڈی کیوں سمجھتی ہو۔

سیوتی۔ میں نہیں سمجھتی۔ تم سمجھتے ہو۔

دیاشنکر۔ غصہ مجھے آنا چاہئے۔ الٹی تم بگڑ رہی ہو۔

سیوتی۔ تمہیں کیوں مجھ پر غصہ آنا چاہئے؟ اسی لئے کہ تم مرد ہو؟

دیاشنکر۔ نہیں اس لئے کہ تم نے آج مجھے میرے دوستوں اور عزیزوں کے سامنے ذلیل کیا۔

سیوتی۔ تم نے مجھے ذلیل کیا۔ میں نے تمہیں ذلیل نہیں کیا۔ تم تو کسی نہ کسی طرح معذرت کر ہی لوگے۔ الزام تو میرے سر پر ہے۔

آنند موہن۔ بھئی گستاخی معاف میں بھی وہیں آتا ہوں۔ یہاں تو کسی چیز کی خوشبو تک نہیں آتی۔

دیاشنکر۔ معذرت کیا کرونگا۔ خواہ مخواہ حیلے کرنے پڑینگے۔

سیوتی۔ چٹنی کھلا کر پانی پلا دو اتنی خاطر کافی ہے۔ ہولی کا دن یہ بھی ایک مذاق رہیگا۔

دیا شنکر۔ مذاق کیا رہیگا۔کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہونگا۔آخر تمہیں یہ کیا شرارت سوجھی۔

سیلوتی۔پھر وہی بات۔شرارت کیوں سوجھتی۔کیا مجھے تم سے یا تمہارے دوستوں سے کوئی کد نکالنی تھی۔پر جب مجبور ہوگئی۔تو کیا کرتی تم تو دس منٹ چھپا کر اور مجھ پر اپنا غصہ اتار کر مبیں سے سو دئے۔یہاں تین بجے سے بیٹھی جھینک رہی ہوں اور یہ سب تمہارے کرتوت ہیں۔

دیا شنکر۔یہی تو پوچھتا ہوں۔کہ میں نے کیا کیا۔

سیلوتی۔تم نے مجھے پنجرے میں بند کر دیا۔پر کاٹ ڈالے۔میرے سامنے دانہ رکھ دو تو کھاؤں۔ٹکھیا میں پانی ڈال دو۔تو پیوں۔یہ کس کا قصور ہے۔

دیا شنکر۔بھئی استعاروں میں باتیں نہ کرو۔صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔

آنند موہن۔رخصت۔آرام کیجئے۔اب چلتا ہوں۔ورنہ بازار کی دوکانیں بھی بند ہو جاویں گی۔خوب چرکا دیا۔خیر یار زندہ صحبت باقی۔لالہ جوتی سروپ تو بیٹھے اپنی مایوسی کو خراٹوں سے بھلا رہے ہیں۔مجھے یہ اطمینان کہاں۔ستارے بھی نہیں ہیں کہ اختر شماری کروں۔اتنیا۔لطیف کی یاد کر رہا ہوں۔

دیا شنکر(زور سے)بھائی جان دو منٹ اور صبر کر جاؤ۔آیا۔ہاں لالہ جوتی سروپ سے کہدو کسی حلوائی کی دوکان سے پوریاں لے آئیں۔یہاں کم پڑگئی ہیں۔آج دوپہر ہی سے ان کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔میرے میز کی دراز میں روپے رکھے ہوتے ہیں۔

سیلوتی۔صاف صاف تو یہی ہے کہ تمہارے پردہ نے مجھے اپاہج بنا دیا۔کوئی

میرا گلا بھی گھونٹ جاتے تو فریاد نہیں کر سکتی۔

دیا شنکر۔ پھر وہی استعارے! ان معموں کا کبھی خاتمہ بھی ہوگا یا نہیں۔

سیوتی۔ دیا سلائی تو تھی ہی نہیں۔ آگ کیوں کر جلاتی۔

دیا شنکر۔ اہا۔ میں نے چلتے وقت سگریٹ پینے کے لئے دیا سلائی کی ڈبیا جیب میں رکھ لی تھی۔ ذرا سی بات کا تم نے اتنا تبنگڑ بنا دیا۔ شاید تم مجھے زک دینے کے لئے موقع ڈھونڈ رہی تھیں۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

سیوتی۔ یہ تمہاری زیادتی ہے۔ جوں ہی تم زینے سے اُترے۔ میری نگاہ ڈبیا پر پڑ گئی۔ غائب تھی۔ سمجھ گئی کہ تم لے گئے۔ تم مشکل سے دروازہ تک پہنچے ہوگے۔ اگر زور سے پکارتی تو تم سُن لیتے۔ مگر نیچے کے دوکانداروں کے کانوں میں بھی آواز جاتی اور تم لوٹ کر نہ جانے میری کیا گت بناتے۔ ہاتھ مل کر رہ گئی۔ اُسی وقت تڑپھڑا رہی تھی۔ کہ کسی طرح دیا سلائی مل جاتی۔ مگر کوئی بس نہ چلتا تھا۔ آخر مایوس ہو کر بیٹھ رہی۔

دیا شنکر۔ یہ کہو کہ تم مجھے زک دینا چاہتی تھیں۔ نہیں تو کیا آگ یا دیا سلائی نہ ملجاتی

سیوتی۔ اچھا تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے نیچے سب کے سب دوکاندار ہیں اور تمہاری جان پہچان کے ہیں۔ گھر کے ایک طرف پنڈت جی رہتے ہیں۔ ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں۔ سارے دن پھاگ ہوتی ہے۔ باہر سے سینکڑوں آدمی جمع تھے دوسری طرف بنگالی بابو رہتے تھے۔ ان کے گھر کی عورتیں کسی عزیز سے ملنے گئی ہیں اور اب تک نہیں آئیں۔ ان دونوں گھروں سے بھی بلا چھجے پر آئے چیز نہ مل سکتی تھی۔ لیکن شاید اتنی بے پردگی تو تم معاف کر دیتے۔ اور کون ایسا تھا جس سے کہتی کہ کہیں سے آگ لا دے۔ مہری تمہارے سامنے ہی چوکا برتن کر کے چلی گئی تھی۔ رہ رہ کر

تمہارے اوپر غصہ آتا تھا۔

دیاشنکر۔ تمہاری معذوری کا کچھ اندازہ تو میں کرسکتا۔ پر اب بھی مجھے یہ ماننے میں تامل ہے کہ دیا سلائی کا نہ ہونا چولھے کے سرد پڑے رہنے کی معقول دلیل ہو سکتی ہے

سیوتی۔ تمہیں سے پوچھتی ہوں۔ تبلاؤ کیا کرتی۔

دیاشنکر۔ میری طبیعت اتنی حاضر تو نہیں ہے۔ پر مجھے یقین ہے کہ تمہاری جگہ پر میں ہوتا تو ہولی کے دن اور خاص کر جب مہمان مدعو ہوں۔ چولھا ٹھنڈا نہ رہتا۔ کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور نکالتا۔

سیوتی۔ مثلاً

دیاشنکر۔ ایک رقعہ لکھ کر نیچے کسی دوکاندار کے سامنے پھینک دیتا۔

سیوتی۔ میں رقعے بازی کرتی۔ تو شاید تم مجھ پر نظر بازی کا الزام لگاتے۔

دیاشنکر۔ اندھیرا ہو جانے پر سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر باہر نکل جاتا اور دیا سلائی لے آتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ میں معمولی چیزیں ضرور ہی تیار ہو جاتیں۔ فاقہ تو نہ ہوتا۔

سیوتی۔ بازار جانے کو تم کوچہ گردی کہتے اور گلا کاٹنے پر آمادہ ہو جاتے۔ تم نے مجھے کبھی اتنی آزادی بھی نہیں دی۔ اشنان کرنے جاتی ہوں تو گاڑی کے ٹپ بند رہتے ہیں۔

دیاشنکر۔ خیر تم جیت گئیں میں ہارا۔ ہمیشہ کیلئے سبق مل گیا۔ آج سے تمہیں ایسے نازک موقعوں پر گھر سے نکلنے کی آزادی ہے۔

سیوتی۔ میں تو ایسے نازک موقع نہیں کہتی۔ نازک موقع تو وہ ہے کہ خدانخواستہ گھر کا کوئی آدمی سخت بیمار ہو جائے اور اُسے ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کی ضرورت پڑے۔

دیاشنکر۔ بیشک وہ نازک موقع ہے۔ اس حالت میں تمہارے جانے میں مجھے کوئی عذر نہ ہوگا

سیوتی۔ اور بھی نازک موقعے گنواؤں۔

دیا شنکر۔ نہیں بھئی۔ اس کا تصفیہ تمہاری فہم و فراست پر ہے۔

آنند موہن۔ یار صبر کی انتہا ہو گئی اب نزع کی حالت ہے بھانہ آباد رہے۔ رخصت

دیا شنکر۔ بس ایک منٹ اور۔ حاضر ہؤا۔

سیوتی۔ چٹنی اور پانی لیتے جاؤ۔ پوریاں بازار سے منگوالو۔ اس کے سوا اسوقت کیا ہو سکتا ہے۔

دیا شنکر (مردانہ کمرہ میں آکر) پانی لایا ہوں۔ پیالوں میں چٹنی ہے۔ آپ لوگ جب تک شوق کریں میں ابھی آتا ہوں۔

آنند موہن۔ شکر خدا کا۔ تم برآمد تو ہوتے میں نے تو سمجھا تھا خلوت میں جا بیٹھے مگر نکلے بھی تو چٹنیاں لے کر۔ وہ لطیف چیزیں کیا ہوئیں جن کا آپ نے وعدہ فرمایا تھا۔ اور جن کی یاد اب تک عاشقانہ اضطراب کے ساتھ کر رہا ہوں۔

دیا شنکر۔ جنتی سروپ کہاں گئے؟

آنند موہن۔ عالم بالا کی سیر کر رہے ہیں عجیب منحوس آدمی ہے۔ آتے ہی آتے سو گیا۔ اور اب تک نہیں چونکے۔

دیا شنکر۔ میرے یہاں ایک سانحہ ہو گیا۔ اُسے اور کیا کہوں سب سامان مُہیّا ہے اور چولھے میں آگ نہیں جلی۔

آنند موہن۔ خوب ایک ہی رہی۔ لکڑیاں نہ ہونگی۔

دیا شنکر۔ لکڑیوں کا تو گھر میں انبار لگا ہؤا ہے۔ ابھی حال ہی میں گاؤں پر سے ایک گاڑی لکڑی آئی تھی۔ دیا سلائی نہ تھی۔

آنند موہن (قہقہہ لگاکر) خوب! یہ اچھا مذاق ہُوا۔ ذراسی بھُول نے سارا خواب ہی پریشان کر دیا۔ کم از کم میری تو بدھیا بیٹھ گئی۔

دیا شنکر۔ کیا کہوں یار۔ بیحد نادم ہوں۔ تم سے سچ کہتا ہوں۔ آج سے میں پردہ کا دشمن ہوگیا۔ اس بیہودہ رواج کی پابندی نے آج عین ہولی کے دن غزہ کرا دیا۔ اب بتلاؤ۔ بازار سے لاؤں پوریاں۔ ابھی تو تازی مل جائیں گی۔

آنند موہن۔ بازار کا راستہ تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ تکلف نہ کرو۔ جاکر بورڈنگ ہاؤس میں کھا لونگا۔ رہے یہ حضرت میرے خیال میں انہیں چھیڑنا مناسب نہیں پڑے خرّاٹے لینے دو۔ صبح کو چونکیں گے تو گھر کی راہ لیں گے۔

دیا شنکر۔ تمہارا یوں واپس جانا مجھے بہت کھل رہا ہے۔ کیا سوچا تھا۔ کیا ہُوا۔ مزے لے لے کر سموسے اور کوفتے کھاتے۔ گلچھرے اڑاتے۔ سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ خیر انشاء اللہ بہت جلد اس کی تلافی کرونگا۔

آنند موہن۔ مجھے تو اس بات کی خوشی ہے۔ کہ تمہارا کفر ٹوٹ گیا۔ اب اتنی اجازت دو کہ اندر جاکر بھابی جان کو مبارکباد دے آؤں۔

دیا شنکر۔ شوق سے جاؤ۔

آنند موہن۔ (اندر جاکر) بھابی صاحبہ کو آداب عرض کرتا ہوں آجکی دعوتِ شیراز سے مجھے گو نہ مایوسی ضرور ہوئی۔ مگر وہ اس خوشی کے مقابلہ میں نفی کے برابر ہے۔ جو بھائی صاحب کے تالیف قلب سے ہوئی ہے آج ایک دیا سلائی نے وہ معجزہ کر دکھایا۔ جو دلیلوں کے ایک دفتر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اور اس عظیم الشان کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اب غالباً بھائی صاحب کو پردہ کی حمایت میں زورِ تقریر صرف کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ (پردہ گرتا ہے) ❖

مایۂ تفریح

کالجوں میں جتنی خوش فعلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ان کا سرمایہ فراہم کیا جائے تو نہایت دلچسپ ہو۔ وہاں بیشتر طلبا معاش کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں بعض تو امتحان کی فکر سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ انہیں خوش وقتی، خوش گپیّ، اور خوش گلوئی کے سوا وہاں اور کوئی شغل نہیں رہتا۔ اس کا عملی جوش کبھی کالج کے ڈرامیٹنگ کلب میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی خاص تقریبوں کے موقعہ پر۔ باقی وقت اپنے اور اپنے احباب کے لئے سامان تفریح مہیا کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ کالج میں جہاں کسی صاحب نے کسی خاص صیغہ میں کسی غیر معمولی انہماک کا اظہار کیا، (باستثنا کرکٹ ہاکی اور فٹ بال) اور وہ مایۂ تفریح بنا۔ اگر کوئی صاحب دھرم کرم کے بڑے پابند ہیں، ہوں، اور پارٹ کرنے میں منہمک رہتے ہیں۔ بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ تو انہیں مایہ تفریح بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی صاحب کتابوں کے عاشق ہیں۔ مطالعہ میں سعی بلیغ کرتے ہیں تو سمجھ لیجئے ان کی تضحیک کے لئے کسی گوشہ میں سازشیں ہو رہی ہیں الغرض کالج میں آزاد منش، آزادہ رو کھلے، دبے آدمیوں کے لئے کوئی دقّت نہیں ان سے کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ لیکن مُلّاؤں اور پنڈتوں کی وہاں مٹی خراب ہے۔

مہاشے چکر دھر الٰہ آباد کے ایک ممتاز کالج کے طالب علم تھے ایم اے کلاس

میں فلسفہ پڑھتے تھے۔ مگر عالم باعمل کے مصداق مزخرفات اور مکروہات سے کوسوں بھاگتے تھے۔ قومیت کے نشہ میں مخمور رہتے۔ ہندو معیار تہذیب کی سادگی اور پاکیزگی پر جان دیتے تھے۔ نکٹائی، کالر، واسکٹ وغیرہ سے اُنہیں دلی نفرت تھی۔ سیدھا سادھا موٹا گاڑھا پہنتے۔ اور چمرودھے جوتے پر قناعت کرتے تھے۔ صبح اُٹھ کر روزانہ سندھیا اور ہون کرتے تھے۔ اور پیشانی پر چندن کا ٹیکہ بھی لگایا کرتے تھے۔ سر گھٹاتے تھے۔ مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی۔ جو چٹیل میدان کے کسی جھنڈ کاڑ درخت کی طرح نمایاں تھی۔ ان کا دعوے تھا کہ چوٹی رکھنے میں قدیم ہندو رشیوں نے اپنی ہمہ دانی کا روشن ثبوت دیا ہے۔ چوٹی کے راستے جسم کی غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ اور مقناطیسی اثرات جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں۔ کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکا کر کھاتے اور بہت زود ہضم اور سادہ۔ ان کا قول تھا کہ غذا کا اخلاقی نشو ونما پر بہت نمایاں اثر پڑتا ہے۔ غیر قومی چیزوں سے کمال احتراز کرتے تھے۔ کبھی کرکٹ یا ہاکی کے قریب نہ جاتے۔ انگریزی تہذیب کو عیوب سے پُر سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انگریزی لکھنے اور بولنے میں بھی حتے الامکان تامل کرتے تھے جس کا اثر یہ تھا کہ ان کی انگریزی بہت کمزور تھی۔ اور سیدھا سا خط بھی مشکل سے لکھ سکتے تھے۔ اگر ان میں کوئی شوق تھا تو پان کا۔ اس کے اوصاف کے قایل تھے۔ اور سنسکرت اشلوکوں سے اپنے دعوے کی تائید کرتے تھے۔

کالج کے بیفکروں کو اتنا صبر کہاں کہ ایسا شکار دیکھیں۔ اور اس پر نشانہ نہ ماریں۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کہ اس موذی کو سیدھے راستہ پر لانا چاہیئے۔ کیسا پنڈت بنا پھرتا ہے کسی کو خیال میں نہیں لاتا اور اپنے سوا اور سب کو قومیت

سے خارج، انسانیت سے عاری سمجھتا تھا۔ اس کی ایسی مٹی پلید کرو۔ کہ یہ سارا اتملاعوزی پن بھول جائے۔

حسنِ اتفاق سے موقع بھی اچھا ملا۔ کالج کھلنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک اینگلو انڈین نازنین فلسفہ کے کلاس میں شریک ہوئی۔ سبب کا سا شگفتہ رنگ۔ بھرا ہوا بدن۔ بے باک نگاہیں۔ توبہ شکن تبسم، اس پر خوش رنگ پوشاک۔ جماعت کے لڑکوں کو دلبستگی کا سامان ہاتھ آیا۔ لوگ تاریخ اور زبان چھوڑ چھوڑ کر فلسفہ کی جماعت میں شریک ہونے لگے۔ سب کی نگاہیں اس ماہرو کی طرف لگی رہتی تھیں۔ سب اس کی نگاہِ ناز کے متمنی۔ اس کی ایک نوائے شیریں کے شیدا تھے۔ مگر جیسا قاعدہ ہے۔ محتاط دلوں پر حسن کا جادو جب چل جاتا ہے۔ تو پھر دارا نیارا کر کے چھوڑتا ہے۔ اور لوگ تو نظارہ بازی میں محو رہتے تھے۔ مگر پنڈت چکر دھر اشتیاق سے بیقرار۔ جذبہ صادق سے دل ریش۔ روئے یار کی طرف تاکتے بھی جھجکتے تھے۔ کہ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے تو اس تلک اور چوٹی پر پھبتیاں اڑنے لگیں۔ نہایت گرسنہ نگاہوں سے دیکھ لیتے مگر آنکھیں چرائے ہوئے۔ سر جھکائے ہوئے کہ کہیں پردہ فاش نہ ہو جائے۔ راز طشت از بام نہ ہو جائے۔

مگر دائی سے پیٹ کیا چھپے گا۔ یاروں نے پنڈت جی کی محبت کی نظر پہچان ہی لی۔ منہ مانگی مراد پائی۔ باچھیں کھل گئیں۔ ان سے دو صاحبوں نے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔ رابطہ و اتحاد مضبوط کیا۔ جب سمجھ گئے کہ ان پر ہمارا اعتبار جم گیا۔ شکار نشانہ کی زد میں ہے۔ تو ایک روز دونوں نے بیٹھ کر لیڈیوں کے انداز میں پنڈت جی کے نام یہ خط لکھا:-

مائی ڈیر جلیر دھر۔

بہت دنوں سے ارادہ کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں۔ پر اس خوف سے کہ آپ مجھے اپنے دل میں بے باک سمجھیں گے۔ اب تک ضبط کرتی رہی۔ لیکن اب نہیں رہا جاتا۔ آپ نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ کہ ایک لمحہ کے لئے بھی آپ کی صورت نگاہ سے نہیں اُترتی۔ آپ زاہدانہ صورت اور نورانی سر اور سادہ پوشش ہر دم آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے۔ مجھے طبعاً تکلف سے نفرت ہے۔ اور یہاں جسے دیکھتی ہوں تکلف اور تصنع کے رنگ میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں جسے دیکھئے میرے عشق کا دم بھرتا ہے۔ پر میں ان عشاق سے خوب واقف ہوں۔ یہ سب کے سب نظر باز شہدے ہیں۔ صرف آپ ایک ایسے وجود ہیں جس میں مجھے جذبۂ صادق اور دل دردمند کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیا میرا یہ خیال غلط ہے۔

بار بار جی چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ باتیں کرتی۔ مگر آپ مجھ سے اس قدر دُور بیٹھتے ہیں کہ گفتگو کا مطلق موقع نہیں ملتا۔ براہ خدا کل سے میرے قریب بیٹھا کیجئے۔ اور کچھ نہ سہی تو آپ کے قریب ہی سے میرے دل پُر ارمان کی تشفی ہوتی رہے گی۔

اس خط کو پڑھ کر چاک کر دیجئے گا۔ اور اس کا جواب لکھ کر لائبریری میں تیسری الماری کے نیچے رکھ دیجئے گا۔

آپ کی "لوسی"

یہ خط ڈاک میں ڈال دیا گیا۔ اور لوگ بنظرِ غائر دیکھنے لگے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ دوسرے ہی دن کالج میں آکر پنڈت جی کو لوسی کے بغل میں بیٹھنے کی فکر ہوئی۔ وہی دونوں حضرات جنہوں نے ان سے راہ و رسم پیدا کی تھی۔ لوسی کے قریب بیٹھا کرتے تھے۔ ایک صاحب کا نام گوردسہائے اور دوسرے کا نام مرزا نعیم اللہ۔ چکردھر نے جا کر گوردسہائے سے کہا۔ یار تم میری جگہ جا بیٹھو۔ مجھے یہاں بیٹھنے دو۔

نعیم۔ کیوں آپ کو کچھ رشک ہوتا ہے کیا۔

چکردھر۔ رشک و شک نہیں۔ وہاں پروفیسر صاحب کا لکچر سنائی نہیں دیتا میری سماعت میں ذرا فرق ہے۔

گردور۔ آپ کی سماعت میں کب سے فرق آگیا۔ پہلے تو آپ کو یہ شکایت نہ تھی

نعیم۔ اور پھر پروفیسر صاحب تو یہاں سے اور دُور ہو جائیں گے۔

چکردھر۔ دُور ہو جائیں گے تو کیا۔ یہاں اچھا رہے گا۔ مجھے کبھی کبھی جھپکیاں آجاتی ہیں۔ سامنے بیٹھے خوف ہوتا ہے۔ کہ کہیں ان کی نگاہ نہ پڑ جائے۔

نعیم۔ اچھی بات ہے بیٹھئے۔ مگر یہ سمجھ لیجئے۔ کہ میں انتہائی نفس کشی سے کام لے رہا ہوں۔ کوئی دوسرا لاکھ روپے بھی دیتا تو یہ جگہ نہ چھوڑتا۔

گردہر۔ جناب یہ بہشت ہے بہشت مگر آپ کی خاطر منظور رہے۔

پنڈت جی بہت ممنون ہوئے۔ اور وہاں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوسی بھی آکر اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔ اب پنڈت جی بار بار اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کہ کچھ باتیں کرے۔ اور وہ ہے۔ کہ لکچر سننے میں ہمہ تن غرق۔ آپ نے سمجھا شاید شرم مانع ہے۔ اس کے ٹیبل کی طرف بار بار منہ پھیرنے لگے۔ اسے ان کے پان

چبانے سے شاید نفرت ہوتی تھی۔ بار بار منہ پھیر لیتی تھی۔ مگر پنڈت جی کی فکر اتنی سی نہ تھی۔ اس قدر خوش تھے۔ گویا چرخِ ہفتم پر ہیں۔ سب کو رعونت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے گویا زبانِ حال سے کہتے تھے تمہیں مقام کہاں نصیب اس جانب کا سا بلند اقبال کیا کوئی ہوگا۔

دن تو گذرا۔ شام کو پنڈت جی خلافِ معمول نعیم کے کمرے میں آئے۔ اور بولے کیوں یار ایک لیٹر رائیٹر کی ضرورت ہے۔ کس کا لیٹر رائیٹر سب سے اچھا ہے؟

نعیم نے پُر معنی انداز سے پوچھا۔ لیٹر رائیٹر لے کر کیا کیجئے گا؟

گرور سہلاتے۔ فضول، نعیم خود کسی لیٹر رائٹر سے کم ہیں۔

چکر دھر ا کچھ شرماتے ہوئے ! اچھا کوئی محبت آمیز خط لکھا جائے تو اس کا القاب کیا ہو؟

نعیم۔ ڈارلنگ لکھتے ہیں۔ اور بہت ہی پیارا ہو۔ تو ڈیر ڈارلنگ لکھ سکتے ہیں۔

چکر دھر۔ اور خاتمہ کیسے کرنا چاہئے۔

نعیم۔ پورا مضمون بتا دیتے تو خط ہی نہ لکھ دیں۔

چکر دھر۔ نہیں آپ خاتمہ بتلا دیجئے۔ میں خط لکھ لونگا۔

نعیم۔ اگر بہت پیارا معشوق ہو تو لکھئے YOUR DYINGLOVER اگر معمولی محبت ہو تو لکھ سکتے ہیں۔ YOURS FOR EVER

چکر دھر۔ کچھ آداب بھی تو ضرور ہوگا؟

نعیم۔ بے شک۔ بلا آداب کے بھی کوئی خط ہوتا ہے۔ اور وہ بھی محبت کا خط معشوق کے لئے۔ آداب میں بہت پُر اثر لفظوں کی ضرورت ہے۔ آپ لکھ سکتے ہیں۔ GOD GAVE YOU EVERLASTING

BEAUTY, MAY YOU REMAIN HAPPY AND LOVELY

پنڈت چکر دھر نے رات کو کمرہ بند کر کے خوب بنا بنا کر خط لکھا، اسے عطر میں بسایا اور دوسرے دن اسے لائبریری میں الماری کے نیچے رکھ آئے۔ یار لوگ تو تاک میں بیٹھے ہی۔ خط اڑا لائے۔ اور اُسے مزے لے لے کر پڑھا۔

۲

اس واقعہ کے تین دن کے بعد چکر دھر کو پھر ایک خط ملا۔ لکھا تھا۔

مائی ڈیر چکر دھر!

تمہارا محبت نامہ ملا۔ بار بار آنکھوں سے لگایا۔ بوسہ دیا۔ آہ کتنی دل آویز خوشبو تھی۔ خدا کرے ہماری محبت ایسی ہی تازہ اور معطر رہے۔ آپ کو شکایت ہے۔ کہ میں آپ سے باتیں کیوں نہیں کرتی۔ پیارے محبت باتوں سے نہیں ہوتی۔ دلوں سے ہوتی ہے۔ جب میں تمہاری طرف سے منہ پھیر لیتی ہوں۔ تو میرے دل پر جو کچھ گزرتی ہے۔ وہ میں ہی جانتی ہوں آپ کو معلوم نہیں۔ کتنی آنکھیں ہر وقت ہماری طرف لگی رہتی ہیں ذرا بھی شُبہ ہؤا۔ اور ہمیں دائمی مفارقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لئے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ میری تم سے ایک التجا ہے۔ معاف کرنا میں تمہیں انگریزی لباس میں دیکھنے کی بہت مشتاق ہو رہی ہوں۔ یوں تو تم کسی لباس میں رہو۔ میرے پیارے لختِ جگر ہو۔ خاص کر تمہارا سادہ کُرتا مجھے بہت ہی پیارا معلوم ہوتا ہے۔ مگر بچپن سے جس لباس کے دیکھنے کی عادی ہو رہی ہوں۔ اسی لباس میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ تم مایوس نہ کرو گے میں نے تمہارے لئے ایک واسکٹ اپنے ہاتھوں سے سی ہے۔ اُسے میری محبت کی ناچیز نشانی سمجھ کر قبول کرو۔

تمہاری

"لوسی"

خط کے ساتھ ایک چھوٹا سا پیکیٹ تھا۔ واسکٹ اسی میں رکھی ہوئی تھی یاروں نے آپس میں چندہ کرکے بڑی فیاضی سے ۳۵ روپے کی رقم جمع کی تھی۔ پنڈت چکردھر یہ خط اور تحفہ پاکر کتنے باغ باغ ہوئے۔ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ کالج میں چھٹی ہوئی۔ تو انہوں نے یہ واسکٹ لاکر اپنے دوستوں کو دکھایا۔ پھر تو اس کی سارے بورڈنگ ہاؤس میں نمائش ہوئی۔ لوگوں نے اس کی تراش کی۔ سلائی کی خوب تعریفیں کی۔ حالانکہ اس کا رنگ اتنا شوخ تھا کہ کوئی متین آدمی پہننا گوارا نہ کرتا۔ چکردھر کو لوگوں نے پورب رخ کھڑا کرکے اچھی ساعت میں یہ واسکٹ زیب تن کرایا۔ آپ ریشہ خطمی ہو گئے۔ جو دیکھتا تھا۔ تعریفوں کے پل باندھ دیتا تھا۔ برادر تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ بالکل یوسف ثانی معلوم ہوتے ہو۔ کیا چہرہ دمکنے لگا۔ گو تپا ہوا کندن ہے۔ ایک واسکٹ پر یہ جوبن ہے۔ کہیں پورا لباس انگریزی ہو تو کیا پوچھنا مسیں لوٹ پوٹ ہو جائیں۔ آخر صلاح ہوئی کہ چل کر ان کے لئے ایک انگریزی سوٹ بنوانا چاہئے۔ کالج کی ایک جماعت ان کے ساتھ سوٹ خریدنے چلی۔ پنڈت مالدار تھے۔ ایک انگریزی دوکان سے بیش قیمت سوٹ لیا گیا۔ رات کو اس خوشی میں گانا بجانا ہوا۔ دوسرے دن دس بجے لوگوں نے پنڈت جی کو سوٹ پہنایا۔ آپ اپنی وضعداری کی شان قائم

رکھنے کے لئے ہوئے۔ مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو نہ جانے یہ لباس کیسے پسند ہے۔

نعیم۔ ذرا آئینہ میں صورت دیکھتے تو معلوم ہو۔ خاص شہزادے معلوم ہوتے ہو تمہارے حسن پر ہمیں رشک آتا ہے۔ خدا نے آپ کو ایسا تو حسن دیا اور اُسے آپ موٹے کرتے میں چھپاتے ہوتے تھے۔

چکر دھر کو نکٹائی باندھنے کا شعور نہ تھا۔ گرو رسہاتے سے بولے بھئی اسے بھی تو بنا دو۔ گرور سہاتے نے نکٹائی اتنی سخت باندھی کہ پنڈت جی کو تنفس دشوار ہو گیا بولے یار بہت تنگ ہے۔

گرور۔ اس کا فیشن یہی ہے۔ ہم کیا کریں۔ ڈھیلی ٹائی عیب میں داخل ہے۔

نعیم۔ تمہیں پھر بھی ڈھیلی کر دی۔ ہم تو اس سے کہیں کس کر باندھتے ہیں۔

چکر دھر۔ یہاں تو سانس لینی مشکل ہے۔

نعیم۔ اور ٹائی کا منشا کیا ہے۔ اسی لئے تو باندھی جاتی ہے۔ کہ آدمی زور زور سے سانس نہ لے۔

چکر دھر کی جان عذاب میں تھی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ چہرہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔ مگر ٹائی کو ڈھیلا کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس فیشن سے آپ کالج میں چلے تو طلبا کا ایک جم غفیر متین اور مودبانہ انداز سے آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ گویا نوشہ کے جلوس میں باراتی اصحاب جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف تاکتا تھا۔ اور رومال منہ پہ دے کر ہنستا تھا۔ مگر پنڈت جی کو کیا خبر۔ وہ اپنی دھن میں مست تھے۔ اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ اس شان سے آکر کلاس میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوسی بھی آئی

انہیں اس لباس میں دیکھا۔ متحیر ہوتی۔ لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ پنڈت جی نے سمجھا۔ یہ اس کی خوشی کا اظہار ہے۔ بار بار مسکرا کر اس کی طرف پُر معنی نگاہوں سے دیکھتے۔ پر وہ مطلق مخاطب نہ ہوتی تھی۔

پنڈت جی کی معاشرت اور مذہبی جوش اور قوم پرستی میں بڑی سُرعت سے انقلاب ہوا۔ سب سے پہلے چوٹی کا صفایا ہوا۔ انگریزی فیشن کے بال ترشوائے گئے۔ لوگوں نے کہا کہ جناب ؟ آپ تو فرماتے تھے کہ چوٹیوں سے مقناطیسی کشش جسم میں داخل ہوتی ہے۔ اب وہ کس راستے سے جائیگی۔

پنڈت جی نے عاقلانہ انداز سے مسکرا کر کہا۔ میں آپ لوگوں کو بیوقوف بناتا تھا کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا تھا۔ کہ یہ سب محض ڈھکوسلا ہے۔ مجھے دل میں اس پر اعتقاد تھوڑا ہی تھا۔ آپ لوگوں کو چکمہ دینا چاہتا تھا۔

نعیم و اللہ آپ ایک ہی شاطر نکلے۔ ہم تو آپ کو بہت سیدھا سادھا آدمی سمجھتے تھے مگر آپ ایک ہی حضرت نکلے۔

چکمہ دھر۔ دیکھتا تھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔

چوٹیوں کے ساتھ سندھیا ہون بھی بند ہوا۔ ہون کنڈ کمرہ میں چارپائی کے نیچے پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے رکھنے کا کام دینے لگا۔ جس آسن پر بیٹھ کر ہون کیا کرتے تھے۔ وہ پائدان بنا۔ اب روزانہ صابون ملتے۔ سر میں تیل ملتے۔ بال سنوارتے۔ سگرٹ پیتے۔ یار لوگ انہیں چنگ پر چڑھاتے رہتے تھے۔ تجویز ہوئی کہ ان حضرت سے واسکٹ کے روپے وصول کرنے چاہئیں۔ معہ سُود کے وصول ہوں۔ پھر کیا تھا۔ لوسی کی طرف سے ایک خط لکھ دیا گیا۔ کہ آپ کی

تبدیل وضع سے مجھے جتنی مسرت ہوئی۔ اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔ مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی۔ اب ماشاء اللہ آپ اس قابل ہو گئے ہیں کہ کوئی یورپین لیڈی آپ کے ساتھ بیٹھنا فخر سمجھے گی۔ اب یہ التجا ہے کہ مجھے اپنی اس مہربانی اور لازوال محبت کی کوئی یادگار مرحمت فرمائیے۔ جسے میں ہمیشہ پاس رکھوں۔ میں کوئی بیش قیمت چیز نہیں۔ صرف آپ کی یادگار چاہتی ہوں۔

چکردھر نے دوستوں سے مشورہ کیا۔ کہ اپنی بیوی کے لئے کچھ سوغات بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیا بھیجنا مناسب ہو گا۔

نعیم۔ جناب یہ تو ان کی تعلیم اور تہذیب پر منحصر ہے۔ اگر تعلیم یافتہ ہیں تو کوئی بیش قیمت، نُسبک، وضعدار چیز بھیجئے۔ یا کئی چیزیں ہوں۔ مثلاً رومال۔ رسٹ واچ لیونڈر کی شیشی، فینسی کنگھے۔ آئینہ۔ لاکٹ۔ بروچ وغیرہ۔ اگر خدانخواستہ گنوار ان ہیں تو کسی دوسرے آدمی سے پوچھئے۔ مجھے گنواریوں کے مذاق کا علم نہیں۔

چکردھر جناب انگریزی تک پڑھی ہوئی ہے۔

نعیم۔ پھر تو میری صلاح پر عمل کیجئے۔

شام کو احباب چکردھر کے ساتھ بازار گئے۔ اور ڈھیر کی ڈھیر چیزیں خرید لائے۔ سب کی سب اعلےٰ قسم کی۔ کوئی چھپتر روپے خرچ ہوتے۔ مگر پنڈت جی نے اُف نہ کی بخندہ پیشانی سے روپے نکالے۔ لوٹتے وقت گرو رنے کہا۔ افسوس ہمیں ایسی خوش مذاق بیوی نہ ملی۔

نعیم۔ جناب دوستی کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک بار ہمیں ان سے بھی نیاز حاصل ہو لیوں پنڈت جی آپ اس میں کچھ ہرج سمجھتے ہیں۔

چکر دھر۔ والدین نہ ہوتے تو کوئی حرج نہ تھا۔ ابھی تو میں ان کا محتاج ہوں اتنی آزادی کیوں کر برتوں۔

نعیم۔ خیر خدا انہیں جلد دار فانی سے نجات دے۔

راتوں رات پیکٹ بنا اور پنڈت جی علے الصباح اُسے لے جا کر لائبریری میں رکھ آتے۔ لائبریری سویرے ہی کھل جاتی تھی۔ کوئی دقت نہ ہوئی۔ انہوں نے ادھر منہ پھیرا۔ اُدھر یاروں نے مال اُڑایا اور چمپت ہوئے۔ نعیم کے کمرہ میں اس کی چندہ کے اعتبار سے تقسیم ہوئی۔ کسی نے گھڑی پائی۔ کسی نے رومال، کسی نے کچھ۔ ایک ایک روپے کے عوض پانچ پانچ روپے ہاتھ لگے۔

۳

عشاق غضب کے صابر ہوتے ہیں۔ پنڈت بچارے اتنے مصارف کثیر کے بعد بھی معشوقہ دلفریب سے ہم کلام ہونے کا موقع نہ پا سکے عجیب معشوقہ تھی جو خطوں میں تو قند و شکر گھول دیتی تھی۔ مگر رو برو ایک نظر دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ بچارے بہت چاہتے۔ کہ خود پیش قدمی کریں۔ پر ہمت نہ پڑتی مخمصے میں پھنسے ہوتے تھے۔ مگر باوجود ان شکستوں کے مایوس نہ تھے۔ ہون سندھیا تو چھوڑ ہی بیٹھے تھے۔ نئے فیشن کے بال کٹ ہی چکے تھے۔ کوٹ پتلون ڈاٹے۔ صاحب بنے گھوما کرتے۔ غلط سلط انگریزی بھی بولتے۔ راتوں کو انگریزی محاورات کی کتاب لے کر سبق کی طرح رٹتے۔ نیچے درجوں میں بھی غریب نے اتنی جفاکشی سے سبق نہ یاد کیا تھا۔ ہر کہیں رٹے ہوئے جملوں کو موقع بے موقع استعمال کیا کرتے۔ دو چار بار لوسی کے سامنے بھی انگریزی بگھارنے لگے جس سے ان کی لیاقت کا پردہ اور بھی فاش ہو گیا۔

مگر ظالموں کو اب بھی ان پر رحم نہ آیا۔ ایک دن چکر دھر کے پاس لوسی کا دوسرا خط پہنچا جس میں بہت عذر اور التجا کے بعد یہ استدعا کی گئی تھی۔ کہ میں نے آپ کو کبھی فٹ بال یا کرکٹ کھیلتے نہیں دیکھا۔ انگریزی جنٹلمین کے لئے مردانہ کھیلوں اور ورزشوں میں مشاق ہونا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ ناچیز درخواست منظور فرمائیں گے انگریزی وضع قطع میں، تقریر میں اب کالج میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ کھیل کے میدان میں بھی کوئی آپ کا ثانی نہ ہو۔ ٹینس ضرور کھیلئے۔ کہ شاید آپ کو کبھی میرے ساتھ لیڈیوں کے مقابلہ میں کھیلنا پڑے۔ تو اُس وقت آپ کی اور آپ سے زیادہ میری سُبکی ہوگی۔

دس بجے پنڈت جی کو یہ خط ملا۔ اور دوپہر کو تفریح کی چھٹی ملی تو آپ نے نعیم سے جا کر کہا۔ یار ذرا فٹ بال نکال دو۔ نعیم فٹ۔ کے کپتان بھی تھے مسکرا کر بولے۔ خیر تو ہے اس دوپہری میں فٹ بال لے کر کیا کیجئے گا۔ یوں تو آپ کبھی میدان کی طرف جھانکتے بھی نہ تھے۔ آج اس جلتی ہوئی دھوپ میں کھیلنے کا ایسا شوق چرایا ہے۔

پنڈت۔ آپ کو اس سے کیا غرض۔ آپ گیند نکال دیجئے میں گیند میں بھی آپ لوگوں کو نیچا دکھاؤں گا۔

نعیم۔ کہیں چوٹ چپیٹ آئے گی مفت میں پریشان ہو جئے گا۔ ہماری ہی سر مرہم پٹی کا بار پڑے گا۔ خدا کے لئے اس وقت رہنے دیجئے۔

پنڈت۔ آخر چوٹ تو مجھے لگے گی۔ آپ کا اس میں کیا نقصان ہوتا ہے۔ آپ کو ذرا سا گیند نکال دینے میں اتنی تکلیف ہے۔

نعیم نے گیند نکال دیا۔ اور پنڈت جی اس جلتی دوپہری میں مشق کرنے لگے۔ بار بار

گرتے تھے۔ بار بار تالیاں پڑتی تھیں۔ مگر وہ اپنی دھن میں ایسے مست تھے۔ کہ خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ اس اثنا میں آپ نے لوسی کو آتے دیکھ لیا۔ باچھیں کھل گئیں اور بھی جوش دکھانے لگے۔ بار بار پیر چلاتے تھے۔ مگر نشانہ خالی جاتا تھا۔ پیر پڑتے بھی تھے۔ تو گیند پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اور لوگ آکر گیند کو ایک ٹھوکر میں آسمان تک پہونچا دیتے۔ تو آپ کہتے ہیں زور سے ماروں۔ تو اس سے بھی اوپر جائے۔ لیکن فائدہ کیا۔ لوسی دو تین منٹ تک کھڑی ان کی بوکھلاہٹ پر ہنستی رہی۔ آخر نعیم سے بولی۔ ول نعیم۔ اس پنڈت کو کیا ہو گیا ہے۔ روزانہ ایک نہ ایک سوانگ بھرا کرتا ہے۔ دماغ میں فتور تو نہیں پڑ گیا۔

نعیم نے کہا معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

شام کو سب بورڈنگ ہوس میں آئے تو یار لوگوں نے جا کر پنڈت جی کو مبارکباد دی۔ یار ہو بڑے خوش نصیب۔ ہم لوگ فٹ بال کو کالج کے کنگرے تک پہنچاتے رہے کسی نے تعریف نہ کی۔ تمہارے کھیل کی سب نے تعریف کی اور خاص کر لوسی نے کہا وہ تو کہتی تھیں جس شائل سے یہ کھیلتے ہیں۔ دیسے میں نے بہت کم ہندوستانیوں کو کھیلتے دیکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ آکسفورڈ کا کوئی مشاق کھلاڑی ہے۔ بہت خوش ہوئی۔

چکردھر۔ اور بھی کچھ بولیں۔ کیا کہا۔ سچ بتاؤ۔

نعیم۔ اجی اب صاف صاف نہ کہوائیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلا۔ بڑے ہوشیار ہو یار ہم لوگ منہ تاکتے رہے۔ اور تم میدان مار لے گئے۔ جبھی آپ روز رنگ بدلا کرتے تھے۔ اب یہ عقدہ کھلا۔ واقعی خوش نصیب ہو۔

چکردھر۔ میں اسی قاعدہ سے گیند میں ٹھوکر مارتا تھا جیسے کتاب میں لکھا ہے۔

نعیم۔ جبھی تو بازی مارے گئے بھئی۔ اور نہیں تو کیا۔ ہم آپ سے کسی بات میں کم ہیں۔ یار تمہاری جیسی شکل و صورت کہاں سے لائیں۔

چکر دھر۔ بہت بناؤ نہ۔ میں ایسا کہاں کا بڑا حسین ہوں۔

نعیم۔ اجی وہ نتیجے ہی سے ظاہر ہے۔ یہاں صابون اور تیل لگاتے لگاتے بھوت ہُوا جاتا ہے۔ اور کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا رنگ بلا ہر اور پھٹکری کے چوکھا ہے۔

چکر دھر۔ کچھ اور تو نہیں کہتی تھیں۔

نعیم۔ اور تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں اتنا دیکھا۔ کہ جب تک کھڑی رہی۔ آپ ہی کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی تھی۔

پنڈت جی کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ سینہ پھولا جاتا تھا۔ جنہوں نے ان کی وہ نُورانی صورت دیکھی ہے۔ عرصہ تک یاد رکھیں گے۔ حالانکہ اس مسرت بے اندازہ کی قیمت بھی انہیں معقول ادا کرنی پڑی۔ کیونکہ اب کالج کا سشن ختم ہونے والا تھا۔ اور احباب کو پنڈت جی کے ماتھے ایک بار دعوت کھانے کی آرزو باقی تھی۔ تجویز ہونے کی دیر تھی۔ تیسرے دن انکے نام محبت نامہ آ پہنچا۔

جدائی کا زمانہ آ رہا ہے۔ نہ جانے آپ کہاں ہونگے۔ اور میں کہاں ہونگی میں چاہتی تھی۔ کہ اس غیر فانی محبت کی یادگار میں ایک پُر تکلف دعوت ہو۔ اگر مصارف آپ کے لئے ناقابل برداشت ہوں تو میں اِس کا پورا بار لینے کو تیار رہوں۔ اس دعوت میں مَیں اور میری سکھیاں آئیں گی۔ کالج کے طلبا۔ اور پروفیسر مدعو ہونگے۔ اور پھر الوداع کہنے کا وقت آئیگا کاش آپ کا مذہب اور آپ کی معاشرت اور میرے والدین رضا مند

ہو جاتے۔ تو تمہیں اتنا مایوس نہ ہونا پڑتا۔ والسلام

آپ کی

"لوسی"

چکر دھر خط پاتے ہی بوکھلا اُٹھے۔ دوستوں نے کہا بھئی چلتے چلاتے مل کر کھانا تو کھالیں مس لوسی کو بھی بلایا جائے۔ اگرچہ ان کے پاس اس وقت روپے نہیں تھے۔ گھر والے ان کے غیر معمولی تقاضوں سے پریشان ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی کی غیرت یہ کب تسلیم کرتی تھی۔ کہ دعوت کا بار مس لوسی پر رکھا جائے۔ اس کے لئے تو ان کی جان حاضر تھی۔ سسرال سے نہ جانے کیا کیا سوانگ رچ کر روپے منگوائے اور دعوت کی تیاریاں وسیع پیمانے پر ہونے لگیں۔ کارڈ چھپوائے گئے۔ کھانا پروسنے والوں کے لئے نئی وردیاں بنوائی گئیں۔ کھانا انگریزی بھی ہوا اور ہندوستانی بھی انگریزی کھانے کے لئے کنگس ہوٹل میں سے معاملہ طے کیا گیا۔ اس میں بہت سہولت ہوئی۔ حالانکہ قیمت گراں تھی لیکن دردسر سے نجات ہوئی۔ ورنہ سارا بار مرزا نعیم اور ان کے دوست گرور پر پڑتا۔ ہندوستانی کھانوں کے منتظم گرور قرار پائے۔

کامل دو ہفتے تیاریاں ہوا کیں۔ نعیم اور گرور تو کالج میں محض تفریح کے لئے تھے پڑھنا پڑھانا تو انہیں تھا نہیں۔ یونہی فضول تضیع اوقات کیا کرتے تھے۔ دعوت کے سلسلہ میں مشاعرے کی رائے پاس ہو گئی۔ شعرا کو کارڈ بھی تقسیم کر دیئے گئے۔ القصہ شاندار ضیافت کا انتظام ہوا۔ احباب نے خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے مسیں بھی دو تین کھینچ لائی گئیں۔ مرزا نعیم لوسی کو گھیر گھار کر لے ہی آئے۔ مگر افسوس ہے کہ دعوت کا انجام پنڈت جی کے حق میں اچھا نہ ہوا۔ بچارے

کی تقدیر میں چلنے چلاتے ذلت اور خفت لکھی تھی۔ یاروں کا تو مشغلہ تفریح تھا اور اس غریب کی جان پر بن رہی تھی۔ سوچے اب تو رخصت ہوتے ہی ہیں۔ شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔ اب کس دن کے لئے صبر کروں۔ دل کی بھڑاس نکال کیوں نہ لوں۔ کلیجہ چیر کر دکھا کیوں نہ دوں۔ یہ ولولے پنڈت جی کے سینۂ بے قرار میں موجزن ہو رہے تھے۔ اور لوگ تو کھانا زہر مار کر رہے تھے۔ اور یہ عاشق ناکام بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ کیونکہ یہ آرزو پوری ہو۔ اب تکلف کیوں۔ حجاب کیوں۔ نالہ خاموش کیوں؟ گریہ پنہاں کیوں؟ بیٹھے بیٹھے کلیجہ مضبوط کیا۔ اور موقع کی تاک میں لگے رہے۔ جب دعوت ختم ہو گئی۔ پان الائچی تقسیم کی جا چکی۔ رخصتی تقریریں ہو چکیں۔ مس لوسی نے بھی اپنی شیریں زبانی کا کمال دکھایا۔ ادھر مشاعرہ گرم ہوا۔ تو پنڈت جی چپکے سے مس لوسی کے پیچھے ہوئے اور راستہ میں اسے جا کر پکڑا۔ وہ انہیں بدحواس اور دوڑے آتے دیکھ کر سہم اٹھی۔ کہ کوئی واردات تو نہیں ہو گئی۔ بولی۔ ول پنڈت کیا بات ہے۔ آپ اتنے پریشاں کیوں ہیں؟ خیر یت تو ہے؟

پنڈت جی کا گلا بھر آیا۔ بولے۔ اب آپ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاؤں گا کیسے صبر کرونگا۔ مجھے تو خوف ہے۔ کہ میرے حواس میں فتور نہ پڑ جائے۔

لوسی نے حیرت میں آکر پوچھا۔ آپ کا منشا کیا ہے۔ آپ بیمار ہیں کیا؟

چکر دھر۔ آہ۔ ڈیر ڈارلنگ، تم پوچھتی ہو۔ میں بیمار ہوں۔ میں مر رہا ہوں۔ نیم جاں ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے لوسی کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ وہ ان کی وحشت دیکھ کر گھبرا اٹھی۔ پھر غصہ میں آکر بولی۔ آپ ہم سے ایسی توہین کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو کف افسوس ملنا پڑیگا۔

چکر دھر۔ دیکھو چلتے چلاتے اتنی بے رخی اور کج ادائی نہ کرو۔ میں نے کس کس طرح یہ کلفت کے دن کاٹے ہیں۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ بس تمہارے خطوط میرے لئے آبِ حیات کا کام کرتے تھے۔ ورنہ اب تک کب کا چل بسا ہوتا۔

لوسی۔ میرے خطوط! میرے خط کیسے؟ میں نے آپ کو کب خط لکھے۔

چکر دھر۔ اتنی جلدی نہ بھول جاؤ۔ ڈیر ڈارلنگ اتنی بے دردی نہ کرو۔ تمہارے وہ محبت کے خطوط جو تم نے مجھے لکھے ہیں۔ میری زندگی میں یادگار رہیں گے۔ تمہاری فرمائش سے یہ وضع بنائی۔ اپنا سندھیا ہون چھوڑا۔ یہ معاشرت اختیار کی۔ دیکھو یہ ستم ظریفانہ مذاق نہ کرو۔ ذرا کلیجے پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کیسی دھڑکن ہو رہی۔

لوسی۔ تم بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو۔ یا کسی نے تمہیں احمق تو نہیں بنایا ہے میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھے۔ ہٹ جاؤ راستہ سے۔

مگر پنڈت جی ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ ان سے معشوقانہ غمزے کر رہی ہے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اسے غصہ آیا۔ اس نے زور سے ایک چانٹا ان کے منہ پر رسید کیا۔ اور غضبناک لہجہ میں بولی۔ احمق ہٹ جا راستہ سے۔ ورنہ ابھی پولیس کانسٹیبل کو بلاتی ہوں۔

بیچارے پنڈت چانٹا کھا کر چوندھیا گئے۔ وہ تو ہوا ہو گئی۔ آپ وہیں زمین پر بیٹھ کر سارے واقعات کا دل میں تبصرہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انہیں سوجھا۔ کہیں کالج کے لوگوں نے تو یہ مذاق نہیں کیا ہے ضرور ایسا ہی ہے۔ ورنہ اسے اتنا پُرغضب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اُف! ظالموں نے بڑا غچا دیا۔ خوب چھانسا دیا۔ جبھی سب مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ وہاں سے غصے میں بھرے ہوئے آئے اور نعیم سے بولے تم

بڑے دغا باز ہو۔ انتہا درجے کے شریر۔ مکار۔ حرام کار۔ مفسد۔ تلنگی۔ کمینے۔ اس کا پھل نہ ملے تو کہنا۔ سڑ سڑ کر مروگے۔

نعیم۔ آخر کچھ بات تو کہئے۔ یا گالی ہی دیتے جایئے گا۔

گردھر۔ کیا بات ہوتی کہیں لوسی سے آپ نے کچھ کہا تو نہیں۔

چکردھر۔ اسی کے پاس سے آرہا ہوں۔ چانٹا کھاکر، ذلیل اور رسوا ہوکر تم دونوں نے مل کر مجھے خوب اُلّو بنایا۔ اس کا بدلہ نہ لیا تو کہنا۔

نعیم۔ اس سے آپ نے کیا کہا۔

چکردھر۔ کیا کہا۔ تمہارا سر۔ اپنی داستانِ عشق سُناتا رہا۔ اس پر اُس نے ایسا چانٹا رسید کیا۔ کہ کان بھنّا اٹھے۔ ہاتھ بھی ظالم کے پتھر ہیں۔

گردھر۔ غضب ہی ہوگیا۔ آپ چوپٹ ہی رہے۔ آپ کے ساتھ اب ہم لوگوں پر بھی آفت آئے گی۔ کہیں اس نے پرنسپل صاحب سے شکایت کردی تو نہ ادھر کے ہونگے نہ اُدھر کے اور جو کہیں اپنے کسی انگیز آشنا سے کہیگی۔ نوجوان کے لالے پڑ جائینگے۔ بڑے بیوقوف ہو۔ اُتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ سب دل لگی تھی۔

چکردھر۔ دل لگی تمہارے لئے تھی۔ میرے لئے تو موت ہے۔ پانچ سَو روپے کے قریب تم لوگ لے مرے۔ امسال پاس ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ بدنام ہؤا۔ یہ الگ یہ دل لگی تھی۔ ایسی ہی دل لگی ہوتی ہے۔ میں تم لوگوں سے سمجھونگا۔ اور میں چاہے نہ سمجھوں۔ ایشور تو سمجھے گا۔

نعیم۔ خیر بگڑنے کا موقع بہت ہے۔ پھر اطمینان سے بگڑ لیجیے گا۔ اب یہ بتایئے کہ مس لوسی نے اگر پرنسپل سے کہا۔ تو کیا حشر ہوگا تینوں آدمی نکال دیتے جائیں گے۔

نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا۔

چکر دھر۔ میں ساری داستان بے کم و کاست بیان کر دونگا۔

گر دھر۔ کیوں یار دوستی کے یہی معنی ہیں۔

چکر دھر۔ جی ہاں ایسے دوستوں کی یہی سزا ہے۔

ادھر تو رات بھر مشاعرہ کا بازار گرم رہا۔ یہاں یہ تگڈم بیٹھا راہ فرار سوچ رہا تھا۔ پرنسپل کے کانوں تک بات نہ پہنچے۔ ورنہ قہر ہو جائیگا۔ انگریز والی بات ہے۔ نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ آخر بہت ردّ و کد کے بعد یہ رائے طے پائی کہ مرزا نعیم اور گردھر علے الصباح مس لوسی کے پاس جائیں اور اس سے معذرت کریں اور اس توہین کے لئے وہ جو تاوان طلب کرے۔ ادا کریں۔

چکر دھر۔ میں ایک کوڑی نہ دونگا۔

نعیم۔ یہاں تو کفن کو کوڑی نہیں ہے۔

گر دھر۔ تو پھر اس کے پاس جانا بیکار ہے۔ وہ بلا تاوان لئے نہ مانے گی۔

نعیم۔ بھائی چکر دھر۔ خدا کے لئے اس وقت بخل نہ کرو۔ ورنہ ہم تینوں کی مٹی خراب ہو گی۔ جو کچھ ہؤا۔ اُسے معاف کرو۔ گذشتہ را صلوٰۃ اب آگے کی فکر کرو۔

چکر دھر۔ یہ ہی ہو گا نہ۔ نکال دیا جاؤنگا۔ دوکان کھول لونگا۔ تمہاری تو مٹی خراب ہوگی۔ اس شرارت کا مزہ چکھوگے۔ اُف کیسا چکما دیا ہے۔

بارے بہت منت اور خوشامد کے بعد پنڈت جی سیدھے ہوئے۔ نعیم علے الصباح مس لوسی کے کمرہ پر پہنچے۔ مگر دریافت کیا۔ تو معلوم ہؤا۔ کہ پرنسپل کے بنگلہ پر گئی ہے اب کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اب خیریت نہیں۔ پرنسپل نے سُنا تو کچا ہی کھا جائیگا۔

تک تک نہ ڈھونڈھے گا۔ اس کمبخت پنڈت کی بدولت عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اس بیہودے کو سوجھی کیا مکر چلا مس لوسی کو عشق جتلانے۔ بن بلاؤ کی سی آپ کی صورت ہے اور شوق ہے حسینوں کے عاشق بننے کا۔ ستم تو یہ ہے۔ کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی ڈبوئے دیتا ہے۔ کہیں لوسی سے راستہ میں ملاقات ہو گئی۔ تو شاید منت سماجت سے مان جائے مکان پر پہنچ چکی ہے تو کوئی اُمید نہیں۔ پھر بائیسکل پر بیٹھے اور بے تحاشہ پرنسپل کے بنگلہ کی طرف چلے۔ ایسے تیز جا رہے تھے۔ کہ اگر بائیسکل ٹھوکر کھا جاتی۔ تو ہڈی پسلی کا پتہ نہ لگتا۔ مگر افسوس راستہ میں لوسی کا پتہ نہیں۔ آدھا راستہ طے ہوا۔ مایوسی کا غلبہ ہونے لگا۔ پھر ہمت کر کے چلے۔ دفعتہً دیکھا۔ کہ وہ پرنسپل کے احاطہ میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ کلیجہ لبوں پر آگیا۔ زور سے پکارا مس ٹرنر۔ ہیلو مس ٹرنر۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔

مس لوسی نے پیچھے پھر کر دیکھا۔ نعیم کو پہچان کر ٹھہر گئی۔ اور بولی۔ مجھ سے اس پنڈت کی سفارش تو کرنے نہیں آتے ہو۔ میں پرنسپل سے اس کی شکایت کرنے جا رہی ہوں۔

نعیم۔ تو پہلے مجھے اور گردھر کو پستول کا نشانہ بنا لو۔ پھر جانا۔

لوسی۔ تم نے میرا کیا نقصان کیا ہے۔ اس پنڈت نے میری توہین کی۔ حد درجہ گستاخی۔

نعیم۔ تمہارے مجرم ہم لوگ ہی ہیں وہ بیچارہ تو ہمارے ہاتھ کا کھلونا تھا۔ یہ ساری شرارت ہم لوگوں کی تھی

لوسی You naughty boy

نعیم۔ سچ کہتا ہوں۔ ہم لوگ تو اسے تفریح کا مشغلہ بناتے ہوتے تھے۔ اس

کی ذرا خبر نہ تھی کہ وہ تمہیں چھیڑنے لگے گا۔ خدا کیلئے اب معاف کردو۔ ورنہ ہم تینوں کا خون تمہاری گردن پر ہوگا۔

لوسی۔ خیر تم کہتے ہو۔ تو پرنسپل سے نہ کہوں گی لیکن شرط یہ ہے کہ پنڈت میرے رُوبرُو بیس مرتبہ کان پکڑ کر اُٹھے بیٹھے۔ اور مجھے سو روپے اس بے ادبی کے تاوان کے طور پر دے۔

نعیم۔ لوسی اتنی بے رحمی نہ کرو۔ یہ سمجھو اُس غریب کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کاش تم اتنی حسین نہ ہوتیں۔

لوسی (مسکراکر) خوشامد کرنا کوئی تم سے سیکھ لے۔

نعیم۔ تو واپس چلو۔ تاوان میں دلا دونگا لیکن تمہاری پہلی شرط سخت ہے۔ نہایت سخت! بچارہ زہر کھاکر مر جائیگا۔ ہاں اُس کے عوض میں پچاس دفعہ کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ سکتا ہوں۔

لوسی۔ تم چھٹے ہوئے شہدے ہو۔ تمہیں شرم کہاں میں اسی کو خفیف کرنا چاہتی بدمعاش میرا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔

نعیم۔ ذرا بھی رحم نہ کروگی؟

لوسی۔ مطلق نہیں۔

کوئی چارہ نہ تھا۔ نعیم لوسی کو بورڈنگ ہاؤس میں لائے۔ پنڈت کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی۔ تو غریب بلبلا اٹھا۔ لوسی کے پیروں پر گر پڑا۔ اور سسک کر رونے لگا۔ نعیم اور گردھر بھی اپنے فعل پر نادم ہوئے۔ بارے لوسی کو درد آیا۔ پہلی شرط معاف کر دی۔ رہی دوسری شرط۔ پنڈت نے گھر پر سہایتی کا تار دیا۔ اور روپے منگا کر لوسی

کے حوالے کئے۔ تب جا کر گلا چھوٹا۔

اس سانحہ کے بعد ایک ہفتہ کالج اور کھلا لیکن پنڈت کو کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا۔ بیچارے مغموم اور متفکر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ لوسی کا نام زبان پر آتے ہی جھلّا اُٹھتے تھے۔ اور بے نقط سُنانے لگتے تھے۔

نعیم اور گردھر نے بھی کان پکڑے۔ کہ اب کبھی ایسی فتنہ انگیزی نہ کرینگے۔ اس سال پنڈت جی فیل ہو گئے۔ مگر اس کالج میں نہ آئے۔ شاید علی گڈھ چلے گئے۔

فلسفی کی محبت

لالہ گوپی ناتھ کی طبیعت دورِ شباب ہی سے فلسفہ کی جانب مائل تھی۔ ابھی وہ انٹرمیڈیٹ کلاس ہی میں تھے کہ مل اور برکلے ان کے نوک زبان ہو گئے تھے۔ وہ ہر قسم کی دلچسپیوں اور تفریحوں سے الگ رہتے۔ یہاں تک کہ کالج کے کرکٹ میچوں میں بھی ان کا جوش تماشا بیدار نہ ہوتا۔ زندہ دل۔ رنگین طبع۔ بذلہ سنج، احباب کی صحبت سے کوسوں بھاگتے۔ اور ان سے حسن ومحبت کا ذکر کرنا تو گویا شیطان کو لاحول سنانا تھا علے الصباح کوئی فلسفہ کی کتاب بغل میں دبا کر گھر سے نکل جاتے۔ اور شہر سے باہر کسی گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ومحو ہو جاتے۔ فسانہ اور شعروسخن سے انہیں مطلق ذوق نہ تھا شاید ہی زندگی میں انہوں نے کوئی قصہ کی کتاب پڑھی ہو۔ اسے تضیع اوقات ہی نہیں۔ بلکہ دل ودماغ کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان میں قومی جوش کی کمی نہ تھی۔ سیوا سمیتنوں میں بڑا انہماک تھا۔ ابنا۔ وطن کی خدمت کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اکثر محلہ کے غریب دوکانداروں کی دوکان پر جا بیٹھتے۔ اور انکی خانگی تردوات اور گھاٹے ٹوٹے کی داستان سُنتے۔ رفتہ رفتہ کالج سے ان کی طبیعت متنفر ہو گئی۔ انہیں اب اگر کسی مضمون سے شوق تھا۔ تو وہ فلسفہ تھا۔ اور کالج کا نصاب تعلیم ان کے مطالعۂ خاص میں خارج ہوتا تھا۔ انہوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اور یکسوئی

اور اطمینان کے ساتھ اپنے مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ مگر اس شوق طلب کے ساتھ عملی خدمات کا جوش بھی بڑھتا گیا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اضطراری طور پر خدام قوم کے زمرہ میں شامل ہو گئے۔ فلسفہ میں روحانی شکوک تھے۔ اور تاریکی اور ہیجان قلب خدمت میں تجسس بھی۔ اور شہرت اور تشکر خاموش۔ وہ زندہ دلی اور حرارت جو برسوں سے فلسفیانہ مسائل کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ طوفانی جوش کے ساتھ اُبل پڑی۔ شہر کی تحریکات عامہ میں کُود پڑے۔ دیکھا تو یہاں میدان خالی تھا۔ جدھر نگاہ دوڑاتے سناٹا نظر آتا تھا۔ علم برداروں کی کمی نہ تھی۔ پر سچے خادم معدوم تھے۔ چاروں طرف ان کی کھینچ ہونے لگی۔ کسی تحریک کے سکرٹری ہوتے کسی کے صدر۔ کسی کے کچھ۔ کسی کے کچھ۔ اس جوش خدمت میں فلسفہ کا ذوق بھی رخصت ہؤا۔ پنجرے میں گانے والی چڑیا کُہسار میں آکر اپنے نغمے بھول گئی۔ حالانکہ اب بھی وہ موقع نکال کر تھوڑی دیر کے لئے روزانہ کتابیں الٹ پلٹ لیا کرتے تھے۔ پر تحقیق و تفحص کی فرصت کہاں۔ اکثر دل پر کشمکش بھی ہوتی تھی۔ کدھر جاؤں۔ اِدھر یا اُدھر؟ فلسفہ اپنی جانب کھینچتا قوم اپنی جانب کھینچتی۔ ایک روز وہ اسی الجھن میں گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے دریا ساحل کے شور و غل سے بےخبر ہواؤں کے جھونکوں سے بے اثر۔ ایک روانی بےتاب کے ساتھ اپنے منزلِ مقصود کی طرف دوڑا چلا جاتا تھا۔ فلسفی نے سوچا۔ میں بھی اسی طرح کیوں نہ یکسو ہو جاؤں۔ وہ اپنے حافظہ میں کسی ایسے فلاسفر کی مثال تلاش کرنے لگے جس نے خدمت قوم کے ساتھ دریائے حقیقت کی غواصی بھی کی ہو۔ دفعتاً ان کے کالج کے ایک پروفیسر پنڈت تربھون ناتھ اگنی ہوتری آکر بیٹھ گئے۔ اور بولے۔ گوپی ناتھ کیا خبریں ہیں؟

گوپی ناتھ نے بے رُخی سے جواب دیا۔ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ دنیا اپنی رفتار قدیم پر چلی جاتی ہے۔

تربھون ناتھ۔ میونسپل وارڈ نمبر ۱۲ کے لئے آپ لوگوں نے کسے تجویز کیا ہے؟

گوپی ناتھ۔ دیکھئے کون ہوتا ہے؟ آپ بھی تو اُمیدواروں میں ہیں۔

تربھون۔ مجھے لوگوں نے زبردستی کھینچ لیا۔ ورنہ مجھے کہاں فرصت

گوپی ناتھ۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ پروفیسروں کی عملی سیاسیات میں اُلجھنا مناسب نہیں۔

تربھون۔ اس طنز سے بہت خفیف ہوتے۔ ایک لمحہ کی خموشی کے بعد انتقام کے ارادہ سے بولے آج کل فلسفہ کا مطالعہ کرتے ہو یا نہیں۔

گوپی۔ بہت کم۔ اس کشمکش میں پڑا ہوں کہ قومی تحریکوں میں شریک ہو جاؤں یا تلاش حق میں عمر صرف کر دوں۔

تربھون۔ قومی تحریکوں میں شریک ہونے کا زمانہ بعد کو آئیگا۔ ابھی تو تمہاری تحصیل علم کا زمانہ ہے۔ جب تک عقائد میں استحکام اور متانت نہ پیدا ہو جائے اس وقت تک محض فوری تحریکوں سے کسی کام کو ہاتھ میں لینا مناسب نہیں۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ قومی خدمت بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔

گوپی ناتھ نے فیصلہ کر لیا۔ یہ زندگی خدمت قوم کے نذر ہوگی۔ تربھون ناتھ نے فیصلہ کیا۔ میں دکھا دوں گا۔ کہ تدریس کے ساتھ میونسپلٹی کی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

۲

گوپی ناتھ کا وقار پہلے ہی سے قائم تھا۔ خاندان مرفہ حال تھا۔ شکر اور سونے چاندی کی دلالی ہوتی تھی۔ اُنکے والد بزرگوار کا تاجروں کے حلقہ میں بہت اعزاز تھا۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ بھی دلالی کرتے تھے۔ آپس میں اتفاق تھا۔ دولت تھی۔ لڑکے بالے تھے۔ اگر نہ تھی تو تعلیم اور تعلیم یافتہ طبقہ میں عزت۔ وہ گوپی ناتھ کی بدولت حاصل ہو گئی۔ ان کی بیکاری کسی کو ناگوار نہ گذری کسی نے انہیں فکر معاش کے لئے مجبور نہ کیا۔ وہ آزاد اور بے فکر ہو کر رفاہ خلق میں منہمک رہتے۔ کہیں کسی یتیم خانہ کیلئے چندہ جمع کرتے کہیں کسی لڑکیوں کیلئے روپے مانگتے اُنکی جانثاری اور اولوالعزمی نے ان تحریکوں میں جان ڈال دی۔ وہ صبح سے شام تک اور لبسا اوقات پہر رات تک انہیں فکروں میں رواں دواں رہتے۔ چندے کا رجسٹر ہاتھ میں لئے انہیں روزانہ شام سویرے امراء کے آستانہ پر کھڑے دیکھنا ایک عام نظارہ تھا۔ رفتہ رفتہ ان کے عقیدت مندوں کی ایک خاص تعداد ہو گئی۔ لوگ کہتے۔ کتنا بے غرض۔ بے نفس۔ جان نثار۔ خادمِ قوم ہے۔ کون صبح سے شام تک بلا کسی قسم کے ذاتی مفاد کے محض فلاح خلق کے لئے یوں دوا دوش کرے گا۔ ان کا ایثار اکثر بے غرضوں میں بھی حسن اعتقاد پیدا کر دیتا تھا۔ گوپی ناتھ کو لبسا اوقات رؤسا و اُمراء کی بے رُخی۔ ترشی۔ یہاں تک کہ ملامت بھی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ انہیں روز بروز تجربہ ہوتا تھا کہ قومی خدمت کم و بیش محض چندے مانگنے کا کام ہے۔ اس کے لئے انہیں اہل زر کی درباداری یا دوسرے الفاظ میں خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ فلسفہ کے اس بے نیاز مطالعہ اور اس قومی گداگری میں کتنا فرق تھا۔ کہاں مل اور کانٹ اسپنسر اور اسپائنے نوادر کے ساتھ

خلوت میں بیٹھے ہوتے حیات و ممات۔ رُوح اور مادہ کے حقائق پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا۔ کہاں اب مغرور، نااہل، کندۂ ناتراش بیوپاریوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرنا پڑتا تھا۔ وہ دل میں انہیں حقیر سمجھتے تھے۔ ان میں دولت کے سوا اور مجھ پر کون سی فضیلت ہے؟ زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جو مشکوک اور ناپسندیدہ ذرائع سے روپے کماتے ہیں۔ پر یہ سب کے سب میرے معبود ہیں۔ انہیں کی ذات اور دستِ کرم پر میری خدمت کا دارومدار ہے۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ کہ میں اس جماعت سے بے نیاز رہ کر خدمت کر سکوں۔

اسی طرح کئی سال گذر گئے۔ لالہ گوپی ناتھ کا شہر کے معززین میں شمار ہونے لگا۔ وہ غریبوں کے دستگیر محتاجوں کے معاون تھے۔ عمر بھی تیس سے تجاوز ہو چلی تھی۔ چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہو رہے تھے۔ گوپی ناتھ ٹالتے چلے آتے تھے لیکن اب آخری فیصلہ کا زمانہ آ پہنچا۔ ایک روز ان کے والد بزرگوار نے کہا۔ اگر تم شادی نہ کرو گے تو میں زہر کھا لوں گا۔ مجھے خاندان کی رسوائی منظور نہیں۔ اس کا انجام ایک نہ ایک دن رُسوائی کا ہونا ہے گوپی ناتھ بڑی تشویش میں پڑے ہفتوں ہو گئے۔ اور کسی فیصلے پر نہ پہنچے۔ قوم اور ذات میں جنگ ہو رہی تھی۔ شادی کا مفہوم تھا...... اپنی نگاہوں کو تنگ کرنا، اپنی وسیع دنیا کو چار دیواری میں بند کر دینا۔ قوم کے لئے مر جانا۔ اور صرف عیال کے لئے زندہ رہنا۔ وہ اب اتنے اونچے معیار سے گرنا شرمناک سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنے کو نااہل اور ناقابل پاتے تھے کسب معاش کے لئے جس دردِ سری، کاوش کی، جس بیساتی کی، تحمل کی ضرورت ہے۔ وہ ان میں مفقود ہو گئی تھی۔ قومی خدمت میں بھی دردِ سر اور

کہ دکاوش کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس میں انکی شانِ بے نیازی قائم رہتی ہے۔ قوم کے لئے بھیک مانگنا فخر ہے۔ اپنے لئے صلہ خدمت کی تمنا بھی مایۂ شرم۔ عیالداری میں اس ابالی پن کا۔ بے فکری کا۔ کہاں گذر۔ ساری قوم کی فکر ایک طرف اور ایک بچے کی بیماری ایک طرف۔ ان حامیوں کیلئے قومی خدمت بہت اچھا بہانہ تھا۔

ایک روز سیر کرنے جا رہے تھے۔ کہ راستہ میں پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہو گئی۔ پروفیسر صاحب اب میونسپل بورڈ کے سکرٹری ہو گئے تھے بسکرات کا ٹھیکہ لینے کی طرف طبیعت لپکتی تھی۔ مگر بدنامی سے ڈرتے تھے۔ افسر مسکرات سے ان کا یارانہ تھا۔ رعایت سے معاملہ ہو جانے کا یقین تھا۔ پھر بھی رسوائی اور انگشت نمائی کا خوف کوئی رائے قائم کرنے نہ دیتا تھا۔ بولے کہئے لالہ صاحب مزاج تو اچھے ہیں؟ آپ کی شادی کے متعلق کیا بات طے ہوئی۔ کب تک ہوگی۔

گوپی۔ میرا تو ارادہ شادی کرنے کا نہیں ہے۔ حالانکہ والد صاحب بہت اصرار کر رہے ہیں۔

اگنی ہوتری۔ ایسی غلطی مت کرنا۔ تم ابھی نوجوان آدمی ہو۔ نفس کی ترغیبات سے واقف نہیں۔ میں نے ایسی کئی مثالیں دیکھی ہیں۔ جہاں تجرد سے فائدے کے عوض نقصان ہی ہوا ہے۔ شادی انسان کو محتاط رکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔ جو اب تک انسان نے دریافت کیا ہے۔ اس تجرد سے کیا فائدہ جس کا انجام چھچھورا پن ہو۔

گوپی ناتھ نے ازراہ انتقام کہا۔ آپ نے مسکرات کے ٹھیکہ کے متعلق کیا فیصلہ کیا۔

اگنی ہوتری۔ ابھی تک تو فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔ مگر اس پیشہ کی طرف طبیعت

راغب نہیں ہوتی کچھ نہ کچھ سبکی کا باعث ضرور ہے۔

گوپی ناتھ۔ ایک کالج کے پروفیسر کے لئے محض باعث سبکی ہی نہیں۔ بلکہ شرمناک ہے۔

اگنی ہوتری۔ کوئی پیشہ بذاتہ شرمناک نہیں ہوتا۔

گوپی ناتھ۔ میں آپ سے اس امر میں متفق نہیں ہوں۔ کتنے ہی ایسے پیشے ہیں جنہیں ایک تعلیم یافتہ آدمی بغیر نشانہ ملامت بنے کبھی قبول نہیں کر سکتا۔

گوپی ناتھ نے آکر اپنے باپ سے کہا میں شادی نہ کرونگا۔ آپ مجھے مجبور کرینگے تو میں فقیر ہو جاؤنگا۔

اگنی ہوتری نے دوسرے دن ٹھیکہ کی درخواست دے دی۔

۳

دو سال گذر گئے ہیں۔ گوپی ناتھ نے ایک لڑکیوں کا مدرسہ قائم کیا ہے۔ اور اس کے منتظم ہیں تعلیمی مسائل کا انہوں نے غائر مطالعہ کیا ہے۔ فلسفہ کے اس شق میں انہیں تبحر کا دعوےٰ ہے۔ اس مدرسہ میں وہ اپنے معیاروں کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بڑی حد تک اس بے دلی کا ازالہ کر دیا ہے جو والدین کو لڑکیوں کی جانب سے ہے معززین شہر اپنی لڑکیوں کو بلا تامل بھیجتے ہیں۔ طرز تعلیم ایسا دلچسپ ہے کہ لڑکی ایک بار وہاں آکر گویا طلسم میں مسحور ہو جاتی ہے پھر اسے گھر پر چین نہیں آتا تین ہی چار سال میں اسے نسوانی ہنروں میں کافی دستگاہ ہو جاتی ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہاں مذہبی مسائل بھی نظر انداز نہیں کئے جاتے ہنود کے مختلف فرقوں کے لئے ایک ہی سلسلہ کتب مقرر ہے۔ مگر کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی۔ امسال انہوں نے انگریزی جماعتیں بھی کھول دی ہیں۔ ایک انگریزی تعلیم یافتہ

گجراتی خاتون کو مبئی سے بلا رکھا ہے۔ ان کا نام آنندی بائی ہے۔ بیوہ ہیں۔ ہندی زبان سے بیگانہ ہیں لیکن گجراتی زبان میں کئی کتابیں تصنیف کر چکی ہیں تعلیم کے اصول اور طرز میں ماہر ہیں۔ ان کے تقرر سے مدرسہ میں اور بھی رونق ہو گئی ہے۔ کئی اصحاب نے جو اپنی لڑکیوں کو منصوری اور نینی تال کے انگریزی مدرسوں میں بھیجنا چاہتے تھے۔ اب انہیں اسی مدرسہ میں داخل کرا دیا ہے۔ آنندی بائی رؤسا کے گھروں میں جاتی ہیں اور تعلیم کا شوق پیدا کرتی ہیں۔ ان کے وضع و قطع میں نفاست ہے۔ خود بھی متمول خاندان کی عورت ہیں۔ اس لئے شہر میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ لڑکیاں ان پر جان دیتی ہیں انہیں "ماں" کہہ کر پکارتی ہیں۔ گوپی ناتھ اپنے انتخاب پر پھولے نہیں سماتے جس سے ملتے ہیں آنندی بائی کے محاسن و اوصاف کی داستان سناتے ہیں۔ باہر سے اگر کوئی نامور شخص آ جاتا ہے اس سے اپنے مدرسہ کا معائنہ ضرور کرواتے ہیں۔ آنندی بائی کی تعریف سے انہیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنی تعریف سے ہوتی۔ اسے وہ بالواسطہ اپنی ہی تعریف سمجھتے ہیں آنندی بائی کو بھی فلسفہ سے ذوق ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ انہیں گوپی ناتھ سے حسنِ ارادت ہے۔ وہ دل سے اس کی تعظیم کرتی ہیں۔ ان کے ایثار اور بے نفس خدمت نے انہیں مسخر کر لیا ہے۔ وہ منہ پر لالہ جی کی تعریف سے اجتناب کرتی ہیں۔ مگر رؤسا کے گھرانوں سے اس کا راگ گاتی ہیں۔ ایسے آدمی آجکل کہاں؟ لوگ نام و نمود پر جان دیتے ہیں کسی کے واسطے مرنا کون ہے۔ میں انہیں آدمی نہیں۔ دیوتا سمجھتی ہوں کتنی سادگی اور قناعت ہے۔ نہ کوئی شوق۔ نہ کوئی تکلف صبح سے شام تک سرگرداں رہتے ہیں۔ نہ کھانے کا وقت معین نہ سونے کا۔ کوئی ایسا

نہیں جو اُن کی آسائش کا خیال رکھے۔ بیچارے جلے بُھنے گھر پر آتے۔ جو کچھ کسی نے سامنے رکھ دیا۔ چُپکے سے کھا لیا۔ پھر چھڑی اٹھائی اور اپنی منزل پر چل کھڑے ہوتے

کنوار کا مہینہ تھا۔ کپٹا پاٹ شالہ میں وجے دسمی منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک ڈرامہ کھیلنے کی تجویز تھی۔ عمارت خوب سجائی گئی تھی۔ شہر کے رؤسا کی دعوت کی گئی تھی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کس کا جوش زیادہ تھا۔ آنندی کا یا لالہ گوپی ناتھ کا۔ گوپی ناتھ سامان فراہم کرتے تھے۔ انہیں سلیقہ سے چننے کی خدمت آنندی بائی نے اپنے سر لی تھی۔ ڈرامہ بھی انہیں کی تصنیف تھا۔

دسمی کا دن تھا۔ دوپہر تک لالہ گوپی ناتھ فرش اور کرسیوں کا انتظام کرتے رہے جب ایک بج گیا۔ اور اب بھی وہ کھانا کھانے گھر نہ گئے۔ تو آنندی نے کہا۔ مہاشے آپ کو کھانے میں دیر ہو رہی ہے۔ اب سب کام ہو گیا۔ جو کچھ کسر ہے۔ وہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔

گوپی ناتھ۔ کھا لوں گا۔ میں وقت معین پر کھانے کا ایسا پابند نہیں ہوں۔ پھر گھر تک کون جائے گھنٹوں کی دیر ہو گی۔ کھانے کے بعد آرام کرنے کو جی چاہیگا۔ شام ہو جائے گی۔

آنندی۔ کھانا تو میرے ہاں تیار ہے۔ براہمی پکانی ہے۔ چل کر بھوجن کر لیجئے۔

گوپی۔ یہاں کیا کھا لوں۔ ایک وقت کھانا نہ کھاؤں گا۔ تو ایسا کونسا نقصان ہو گا۔

آنندی۔ جب کھانا تیار ہے۔ تو فاقہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

گوپی۔ آپ جائیں۔ بیشک آپ کو دیر ہو رہی ہے۔ میں کام میں ایسا بھولا کہ آپ کی یاد ہی نہ رہی۔

آنندی۔ آپ مذاق کرتے ہیں تو مجھے ہی ایک وقت کھانا نہ کھانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے۔

گوپی۔ نہیں۔ نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں اکثر ایک ہی وقت کھاتا ہوں۔

آنندی۔ آپ کے انکار کا راز سمجھ گئی۔ تعجب ہے۔ اب تک یہ معمولی سی بات کیوں نہ سوجھی کتنی سست عقل ہوں!

گوپی۔ کیا سمجھ گئیں؟ میں چھوت چھات کا قائل نہیں ہوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔

آنندی۔ اتنا جانتی ہوں۔ مگر جس وجہ سے آپ میرے یہاں بھوجن نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے متعلق میں آپ سے اتنا عرض کرتی ہوں۔ کہ مجھے آپ سے محض ماتحتی کا تعلق نہیں ہے۔ مجھے آپ سے روحانی پریم ہے۔ آپ کا میرے پان پھول سے انکار کرنا اپنے ایک سچے بھگت کی دل شکنی کرنا ہے۔ میں آپ کو اسی نظر سے دیکھتی ہوں۔

گوپی ناتھ کوئی عذر نہ کر سکے۔ جا کر کھانا کھالیا۔ وہ جب تک آسن پر بیٹھے رہے آنندی پنکھا جھلتی رہی۔

اگنی ہوتری اور ان کے ندیموں نے اس واقعہ کی یوں تفسیر کی۔ لالہ صاحب اب تو وہیں کھانا بھی تناول فرماتے ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ دونوں میں روحانی مناسبت

ہے۔ دیکھیں یہ روحانیت کیا گل کھلاتی ہے۔

۴

ضابطہ اور تکلف کا پردہ ہٹنے لگا۔ لالہ گوپی ناتھ کو اب ضرور تاً تصنیف کا شوق ہو گیا تھا۔ گھر سے انہیں ضروری مصارف مل جاتے تھے۔ مگر اخباروں اور کتابوں کے لئے کبھی کبھی انہیں بہت مجبور ہونا پڑتا تھا۔ علاوہ بریں اب ان کی خودداری ذرا ذرا سی باتوں کے لئے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے مانع ہوتی تھی۔ وہ اپنی ضرورتیں آپ ہی پوری کر لینی چاہتے تھے۔ گھر پر لڑکے اتنا شور و غل کرتے کہ کام کرنے میں ان کی طبیعت نہ لگتی۔ گھر کے لڑکوں پر ان کے اصولِ تعلیم کا اچھا اثر نہ نظر آتا تھا۔ اس لئے جب ان کی طبیعت جولان پذیر ہوتی تو بے تکلف کنیا پاٹ شالہ میں چلے جاتے۔ آنندی بائی بھی وہیں رہتی تھیں تخلیہ ملتا۔ کام کرنے میں جی لگتا۔ کھانے کا وقت آ جاتا۔ تو وہیں کھانا بھی کھا لیتے۔ رفتہ رفتہ آنندی نے محرر کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ لالہ صاحب بولتے جاتے تھے۔ وہ لکھتی جاتی تھیں۔ لالہ صاحب کی ہی تحریک سے آنندی نے ہندی سیکھ لی تھی۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اتنی استعداد پیدا کر لی تھی۔ کہ اب اُسے لکھنے میں ذرا بھی جھجک نہ ہوتی تھی۔ لکھتے وقت اُسے بعض اوقات ایسے الفاظ اور محاورے سوجھ جاتے کہ لالہ صاحب پھڑک اُٹھتے عبارت میں جان سی پڑ جاتی کہتے اگر تم خود لکھو تو مجھ سے بہت اچھا لکھو گی۔ میں تو محض بیگار کرتا ہوں۔ تم میں خداداد ملکہ ہے۔ شہر کے قاضیوں میں راستے زنی ہونے لگی۔ پر اہلِ فلسفہ اپنے ضمیر کی صفائی کے سامنے زبانِ حسد کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ آنندی کہتی۔ دنیا کے منہ میں زبان ہے۔ جو

چاہے کیسے۔ پر میں اس آدمی سے پرہیز نہیں کر سکتی جس سے مجھے روحانی تعلق ہے
گوپی ناتھ اتنے بے باک نہ تھے۔ زبان خلق پر اُن کے نام نیک کا انحصار تھا۔ وہ
اس کی تحقیر نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے رفتہ رفتہ انھوں نے دن کی بجائے رات کو
تصنیف کا شغل اختیار کیا۔ کنیا پاٹ شالا میں رات کو کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تھا
تنہائی میں خوب کام کرتے۔ وہ خود آرام کرسی پر لیٹ جاتے۔ آنندی میز پر بیٹھی قلم
لئے ان کی طرف دیکھا کرتی۔ اس کی نگاہ سے ادب اور احترام، عقیدت اور محبت
ٹپکی پڑتی تھی۔ گوپی ناتھ جب کسی خیال کو دل میں ترتیب دینے کے بعد۔ بولنے کے
قبل آنندی کی طرف دیکھتے۔ کہ وہ لکھنے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ تو دونوں کی
نگاہیں مل جاتیں۔ گوپی ناتھ اس طرز عمل کے ایسے عادی ہوتے جاتے تھے۔ کہ اگر
کبھی یہاں آنے کا موقع نہ ملتا۔ تو گونہ اضطراب ہوتا تھا۔

گوپی ناتھ کو آنندی کے آنے سے قبل صنفِ نازک کا ذاتی تجربہ نہ تھا۔ حکماء
سابق وحال کی کتابیں ان کی نظر سے گذری تھیں۔ سب جگہ عورت روحانی ترقی کی
مانع، قومی خدمت کی سدّراہ، دل کو پستی۔ تنگ خیالی۔ اور کام چوری کی طرف لے
جانے والی۔ زہریلی ناگن، شراب دوآتشہ۔ دودھاری تلوار بنائی گئی تھی۔ یہاں تک
کہ مغرب کے علماء۔ کا بھی یہی فیصلہ تھا۔ انہیں وجوہ سے انھوں نے تجرد کو ترجیح دی
تھی۔ مگر اب تجربہ تبلا رہا تھا۔ کہ عورت تحریک خیر بھی کر سکتی ہے۔ وہ حقیقت کے
راستہ کی رفیق بھی بن سکتی ہے۔ اس کے فیض صحبت سے اچھے کام بھی ہو سکتے ہیں۔
تب ان کے دل میں سوال پیدا ہونا شروع ہوا۔ اگر آنندی کے ساتھ میری
شادی کرنے کی تجویز ہوتی۔ تو مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ اس کے ساتھ تو میری

زندگی بڑے لطف سے گذرتی۔

ایک روز وہ آنندی کے یہاں آئے تو سر میں درد تھا۔ کچھ لکھنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوئی۔ آنندی نے اُن کے سر میں تیل ملنا شروع کیا۔ وہ بہت نہیں نہیں کرتے رہے۔ پر اُس نے شیشی اُن کے سر پر انڈیل ہی دی۔ اُس وقت گوپی ناتھ کے دل پر ایک عجیب سکون بخش سُرور انگیز کیفیت طاری ہوئی۔ جذبات نے ناطقہ پر یورش کی۔ لیکن گوپی ناتھ نے درد اور حسرت کا ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلنے دیا ہاں اُسی دن سے اُنہوں نے آنندی کے یہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک پورا ہفتہ گذر گیا۔ اور نہ گئے۔ آنندی نے لکھا۔ آپ کے آنے کی سخت ضرورت ہے۔ مدرسہ کے متعلق کئی انتظامی اُمور میں آپ سے صلاح لینی ہے۔ گوپی ناتھ نے اس خط کا جواب نہ دیا۔ آنندی نے پھر لکھا۔ آپ کی کتاب ادھوری پڑی ہے۔ اسے ختم کر ڈالیئے تو جلد پریس چلی جائے۔ تب بھی نہ گئے۔ تیسری بار اُس نے لکھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ میں نے جان بوجھ کر تو آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن واقعی آپ ناراض ہیں۔ تو میں یہاں رہنا اپنی خودداری کی شان کے خلاف سمجھتی ہوں۔ اگر آپ اب بھی نہ آئیں گے۔ تو مدرسہ کا چارج دوسری اُستانی کو دے کر چلی جاؤں گی۔ گوپی ناتھ اب بھی نہ پسیجے۔ آخر دو مہینہ کی بے اعتنائی کے بعد انہیں معلوم ہؤا کہ آنندی بیمار ہے۔ اور دو دن سے مدرسہ نہیں آئی۔ تب وہ کسی حیلہ یا دلیل سے اپنے نفس کو تسکین دے سکے آئے کچھ جھجکتے۔ کچھ شرماتے۔ آنندی کے کمرہ میں قدم رکھا۔ دیکھا تو وہ خاموش پڑی ہوئی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ جسم گھُل گیا تھا۔ اس نے ان کی طرف چشم فریاد سے دیکھا۔

اٹھنا چاہا۔ مگر ضعف نے اجازت نہ دی۔ گوپی ناتھ نے کہا لیٹی رہو۔ کوئی ضرورت نہیں۔ میں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب آتے تھے؟"

خادمہ نے کہا۔ جی ہاں دو بار آتے تھے۔ دوا دے دی ہے۔

گوپی ناتھ نے نسخہ دیکھا تو ضعفِ جگر معلوم ہوا۔ زیادہ تر ادویات مسکن و مقوی تھیں آنندی کی طرف پھر دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بے اختیار جی بھر آیا۔ جگر میں ایک ٹیس سی گئی۔ دل کو زبان پر رکھ کر بولے۔ آنندی تم نے اپنی بیماری کی اطلاع مجھے پہلے نہ دی ورنہ یہ نوبت نہ آتی۔

آنندی۔ کوئی بات نہیں۔ اچھی ہو جاؤں گی۔ جلد ہی اچھی ہو جاؤں گی۔ مر بھی جاؤں گی تو کون رونے والا بیٹھا ہے؟ یہ کہتے کہتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

گوپی ناتھ فلسفی تھے۔ مگر ابھی ان کے جذبات میں جان باقی تھی۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔ آنندی کم سے کم دنیا میں ایک ایسا کوئی ہے۔ جو تمہارے لئے اپنی جان تک دے دیگا۔ یہ کہتے کہتے وہ رُک گئے۔ انہیں اپنا انداز کلام کچھ غیر موزوں معلوم ہوا۔ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے وہ ان سوفیانہ الفاظ کی نسبت زیادہ شاعرانہ۔ زیادہ پاکیزہ۔ زیادہ مہر انگیز طرز ادا چاہتے تھے۔ پر وہ الفاظ ذہن میں نہ آتے

آنندی نے شکایت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ دو مہینے تک کس پر چھوڑ دیا تھا

گوپی ناتھ۔ آنندی۔ چھوڑ نہیں دیا تھا۔ اپنی تقدیر کو روتا تھا۔ یہی سمجھ لو کہ میں نے نہ جانے کیا سمجھ کر خودکشی نہیں کر لی۔ میں نے نہ سمجھا تھا۔ کہ اپنے عہد پر قائم رہنا میرے لئے اتنا دشوار ہو جائے گا۔ میں نے اس دوران میں ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اخباروں کی چٹ تک نہیں کھولی۔ شاید ہی کبھی آنکھوں میں نیند آئی ہو۔ بس

ایک ہی خیال۔ ایک ہی صورت۔ ایک ہی بات شب و روز دل میں جمی رہتی تھی۔

آنندی نے گوپی ناتھ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ اب تو کبھی اتنی بے اعتنائی نہ کیجئے گا۔

گوپی ناتھ۔ انجام کیا ہے؟

آنندی کچھ بھی ہو؟

گوپی ناتھ۔ کچھ بھی ہو؟

آنندی۔ ہاں۔ کچھ بھی ہو؟

گوپی ناتھ۔ رسوائی۔ تحقیر۔ بدنامی۔ شرمندگی۔

آنندی: میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں اور میرے لئے آپ کو بھی سہنا پڑیگا۔

گوپی ناتھ۔ آنندی۔ میں اپنے تئیں پریم پر نثار کر سکتا ہوں لیکن نام کو نہیں میں انگشت نمائیوں کی پُر معنی نگاہوں کی اہانت آمیز کنایوں کی چوٹیں نہیں برداشت کر سکتا۔

آنندی۔ نہ کیجئے۔ آپ نے بہت ایثار کے بعد یہ کمائی کی ہے۔ میں آپ کو اس سے محروم کرنا نہیں چاہتی (گوپی ناتھ کا ہاتھ پکڑ کر) اس کو چاہتی ہوں اس سے اور زیادہ تیاگ کی تمنا نہیں رکھتی۔

گوپی ناتھ۔ دونوں باتیں ساتھ ممکن ہیں۔

آنندی: ممکن ہیں۔ میرے لئے ممکن ہیں۔ میں آپ کے پریم کے لئے اپنی آتما بھی نچھاور کر سکتی ہوں۔

۵

اس کے بعد لالہ گوپی ناتھ نے آنندی کی بُرائی کرنی شروع کی --- دوستوں سے کہتے ان کی طبیعت اب کام میں نہیں لگتی۔ پہلے کی سی تن دہی نہیں ہے۔ کسی سے کہتے۔ وہ اب یہاں سے بر داشتہ خاطر ہیں۔ گھر جانا چاہتی ہیں۔ ان کی منشا ہے مجھے سالانہ ترقی ملا کرے۔ اور اُس کی یہاں گنجائش نہیں۔ مدرسے کے کئی معائنے کئے اور کیفیت بہت خراب لکھی۔ انتظام تعلیم۔ سبھی صیغوں میں ایک افسوسناک انحطاط کا اظہار کیا۔ سالانہ انتظام میں جب بعض ممبروں نے آنندی کی ترقی کا مسئلہ پیش کیا تو گوپی ناتھ نے سخت مخالفت کی۔ اُدھر آنندی نے بھی لالہ گوپی ناتھ کے دُکھڑے رونے شروع کئے۔ کہتیں یہ آدمی نہیں پتھر کے دیوتا ہیں۔ اُنہیں خوش رکھنا محال ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ اُنہوں نے شادی نہیں کی۔ ورنہ غریب ان کے نخروں کی نذر ہو جاتی۔ کہاں تک کوئی صفائی اور انتظام کی طرف دھیان دے۔ دیوار پر ایک دھبہ بھی پڑ گیا۔ کسی کونے کھڑکی میں ایک جالا بھی لگ گیا۔ برآمدوں میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی پڑا مل گیا۔ تو آپ میرے سر ہو جاتے ہیں۔ تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ دو سال میں نے جوں توں کر کے نباہا۔ لیکن دیکھتی ہوں۔ لالہ صاحب کی سخت گیریاں روز بروز بڑھتی جاتی ہیں۔ ایسی حالت میں زیادہ دن یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔ میرے لئے روزانہ فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ جب چاہوں گی۔ اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ یہاں آپ لوگوں سے محبت ہو گئی ہے۔ لڑکیوں سے پیار ہو گیا ہے۔ اسی لئے چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا تعجب یہی تھا کہ اور کسی دوسرے آدمی کو مدرسہ کے انتظام یا تعلیم میں انحطاط نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ حالت پہلے سے بدرجہا بہتر تھی۔

ایک دن پروفیسر اگنی ہوتری سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے پوچھا کیسے مدرسہ کی کیا کیفیت ہے؟

گوپی ناتھ۔ کچھ نہ پوچھئے۔ آج کل حالت روز بروز گرتی جاتی ہے۔

اگنی ہوتری۔ آنندی بائی نے تساہل شروع کر دیا۔

گوپی ناتھ۔ جی ہاں۔ سراسر۔ اب کام میں ان کا جی نہیں لگتا۔ بس زیادہ تر یوگ اور گیان کی کتابیں پڑھا کرتی ہوں۔ کتنا ہوں۔ تو جواب دیتی ہیں۔

میں اب اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ پرلوک کی بھی فکر چاہئے کہ چوبیسوں گھنٹے پیٹ کی ہی نذر کروں۔ پیٹ کے لئے پانچ گھنٹے بہت ہیں۔ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ پہلے کچھ دنوں تک بارہ گھنٹے دیتے تھے۔ مگر وہ حالت ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی۔ میں نے یہاں تک اپنی صحت زائل کر دی۔ ایک بار سخت بیمار پڑی۔ کیا کمیٹی نے میرے معالجہ کی فکر کی؟ کوئی بات پوچھنے بھی نہ آیا۔ پھر میں کیوں جان دوں سُنا ہے عورتوں میں میری بدگوئی بھی کیا کرتی ہیں۔

پروفیسر صاحب نے عارفانہ انداز سے ہنس کر کہا۔ یہ سب روحانیت کے کرشمے ہیں۔ میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔

دو سال اور گذر گئے۔ رات کا وقت تھا۔ کنیا پاٹ شالا کے اوپر والے کمرہ میں لالہ گوپی ناتھ میز کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب ہی آرام کرسی پر آنندی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ کئی منٹ کی خموشی کے بعد گوپی ناتھ نے کہا۔ میں نے تم سے پہلے ہی ماہ میں کہا تھا۔ متھرا چلی جاؤ۔

آنندی - میرے پاس اتنے روپے کہاں تھے - اور نہ تمہیں کچھ انتظام کر سکتے تھے - اس لئے میں نے سوچا تین چار مہینے یہاں ادر ہوں - اس عرصہ میں کچھ پس انداز بھی کر لوں گی - تمہاری کتاب سے بھی کچھ روپے مل جائیں گے - تب متھرا چلی جاؤں گی - مگر کیا معلوم تھا کہ بیماری بھی اس موقعہ کی منتظر ہے - میری طبیعت ایک ہفتہ کے لئے بھی سنبھلی ادر میں روانہ ہوتی - مگر موجودہ حالت میں سفر کرنا میرے لئے قریباً غیر ممکن ہے -

گوپی ناتھ - مجھے یہ خوف ہے کہیں یہ بیماری طول نہ کھینچے - مہینے دو مہینے بھی یہاں رہنا پڑے تو راز افشا ہو جائے گا

آنندی - (چڑھ کر) ہو جاتے گا - ہو جاتے گا - اب اس سے کہاں تک ڈروں ؟

گوپی ناتھ - میں بھی نہ ڈرتا - اگر میرے باعث شہر کی کئی تحریکوں کی زندگی خطرے میں نہ پڑتی - مجھے اس لئے نام نیک کی پرواہ ہے - سوسائٹی کی ان قیدوں کو مہمل سر بسر ناروا سمجھتا ہوں - تم اس بارے میں میرے خیالات سے بخوبی واقف ہو - مگر کروں کیا - بدقسمتی سے میں نے اپنے اوپر قومی خدمت کا بار لے لیا ہے - اور یہ اسی کا نتیجہ ہے - کہ آج مجھے اپنے بناتے اصولوں کو توڑنا پڑ رہا ہے - اور جو چیز مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے - اُسے یوں خطروں سے ہٹانے کے سوا اور کوئی نجات کی صورت نظر نہیں آتی -

مگر آنندی کی طبیعت سنبھلنے کی بجائے روز بروز گرتی ہی گئی - ضعف سے اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا - پر کسی ڈاکٹر یا وید کو اس کی حالت افشا کے خوف سے نہ دکھائی

جاتی تھی۔ گوپی ناتھ دوائیں لاتے تھے۔ آنندی کمرے میں پڑے پڑے پٹی تھی اور
ضعیف سے ضعیف تر ہوتی جاتی تھی۔ مدرسہ سے اس نے رخصت لے لی تھی۔
کسی سے ملتی جلتی نہ تھی۔ بار بار ارادہ کرتی متھرا چلی جاؤں۔ مگر ایک انجان دیس
میں بے یار و مددگار کیسے رہوں گی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے کوئی ایک گھونٹ پانی دینے
والا بھی نہیں۔ یہ سب سوچ کر اس کی ہمت رخصت ہو جاتی تھی۔ اسی پس و
پیش اور حیص بیص میں دو مہینے اور گذر گئے۔ اب آنندی نے یہ فیصلہ کیا۔ ہر چہ بادا باد
یہاں سے چل ہی دوں ہم کو تکلیف دہ فیصلوں کے التوا میں نجات نظر آتی
ہے۔ آنندی نے اب سوچا۔ سفر میں مر جاؤں گی۔ تو مضائقہ نہیں۔ ان کے نام
نیک پر تو حرف نہ آئے گا۔ میرے منہ پر تو کالکھ نہ لگے گی۔ انہیں میرے باعث
ذلت اور خفت تو نہ اٹھانی پڑے گی۔ طعنے نہ سننے پڑیں گے۔ سفر کی تیاریاں کرنے
لگی۔ جو آج سے دو مہینہ قبل ہوتیں تو منشا پوری ہو جاتی۔ پر اب ہشت بعد از جنگ
تھیں۔

رات کو جانے کا قصد تھا۔ تانگے والے سے وقت پر آنے کی تاکید کر دی گئی۔
تھی۔ دفعتاً سر شام ہی سے آنندی کو دردِ زہ شروع ہوا۔ اور گیارہ بجتے بجتے ایک
ننھی سی ضعیف اور نیم جان ہستی ظہور میں آئی۔ بچے کے رونے کی آواز سنتے ہی لالہ
گوپی ناتھ بے تحاشا اوپر سے اترے۔ اور گرتے پڑتے گھر بھاگے۔ غریب آنندی
نے اس راز کو دمِ آخر تک چھپاتے رکھا۔ اپنے درد جانگزا کی کسی کو اطلاع نہ دی
خادموں کو پہلے ہی سے شکوک تھے۔ انہیں زیادہ تعجب نہ ہوا۔ آنندی بیہوش
تھی

۶

دوسرے دن دس بجتے بجتے خبر سارے شہر میں پھیل گئی۔ گھر گھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی تعجب کرتا تھا۔ کوئی نفرت کرتا تھا۔ کوئی مذاق اڑاتا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ کے بدخواہوں کی تعداد کافی تھی۔ پنڈت نربھون ناتھ اگنی ہوتری ان کے سرغنہ تھے۔ ان لوگوں نے مہاشئے گوپی ناتھ کو بدنام کرنا شروع کیا۔ جہاں دیکھئے وہاں دو چار آدمی بیٹھے رازدارانہ انداز سے اس واقعہ کی تلمیح و تفسیر کرتے نظر آتے تھے کوئی کہتا تھا اس عورت کے لچھن پہلے ہی سے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ نہیں تو بمبئی سے یہاں آتی ہی کیوں۔ اُسے جواب ملتا تھا۔ اس غریب کی خطا نہیں ہے۔ یہ سارے کرتوت اسی بنے ہوئے علینک باز فلاسفر کے ہیں۔ اگر یہی کرنا تھا۔ تو شادی کیوں نہ کر لی۔ تب تو برہم چاری بننے کا حمق سوار تھا۔ اب اس چھچھورے پن پر کمر باندھی ہے۔ اُسے تو منہ میں کالکھ لگا کر کہیں ڈوب مرنا چاہئے۔ استفسار حال کے بہانہ سے لوگ گوپی ناتھ کے گھر جاتے اور انہیں خفیف کرکے چلے آتے تھے۔ ہر شخص کو انہیں خفیف کرنے میں مزا آرہا تھا۔ اس کے برعکس آنندی کی حالت پر لوگوں کو رحم آتا تھا۔

مگر گوپی ناتھ کے کتنے ہی عقیدت مند ایسے ہی تھے۔ جو اس واقعہ کو ان کی ذات سے کسی طرح منسوب نہ کرسکتے تھے۔ یہ کسی شریر النفس کی حرکت ہے جس شخص نے کبھی عورتوں کا ذکر تک نہ کیا۔ وہ آج یہ حرکت کریگا۔ اگر انہیں یہی کرنا ہوتا۔ تو شادی نہ کرلیتے!

گوپی ناتھ نے خود ایک متشکک کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ سب کی سنتے تھے

اور خاموش رہتے تھے۔

سوال تھا اب کیا ہو۔ آنندی کی نسبت تو کلام کا موقع نہ تھا۔ وہ عضو ناقص تھی۔ بحث یہ تھی۔ لالہ گوپی ناتھ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ عام فیصلہ تھا کہ انہوں نے جو حرکت کی اُس کا پھل کھائیں۔ آنندی بائی کو باقاعدہ طور گھر میں رکھیں پہلا کا بر شہر غیر جانب داری کو زیادہ ترجیح دیتے تھے ہمیں اس سے کیا مطلب۔ آنند تی جانیں اور وہ جانیں ہاں انہیں اب پاٹ شالا کی منیجری سے الگ کر دینا چاہیئے۔

پروفیسر اگنی ہوتری اور اُن کے رفقا گوپی ناتھ کو اتنے سستے نہ چھوڑنا چاہتے تھے۔ انہیں گوپی ناتھ سے پرانا حسد تھا۔ یہ کل کا لونڈا محض دو چار کتابیں اِدھر اُدھر پڑھ کر فلسفہ میں شُد بُد کر کے شہر میں لیڈر بنا ہوا گھومے۔ عینک لگائے ریشمی دُوپٹہ گلے میں ڈالے سب کو مربیانہ انداز سے دیکھے۔ گویا پارسائی اور ایثار کا پُتلا ہے۔ ایسے لوگوں کا پردہ کیوں نہ فاش کیا جائے۔ قوم کو ایسے دغا باز حرام کار۔ خدمت گذاروں سے کیوں نہ متنبہ کیا جائے۔ یہ لوگ کنیا پاٹ شالا کی معلموں سے۔ چوکیداروں سے۔ خادماؤں سے تفتیش کرتے تھے۔ لالہ گوپی ناتھ یہاں کب آتے تھے؟ کب جاتے تھے؟ کتنی دیر تک رہتے تھے؟ کیا کیا کرتے تھے؟ تم لوگ وہاں جاتے تھے۔ یا جانے کی ممانعت تھی۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہوں کے ملازم اور وہ بھی ایسے جو گوپی ناتھ کی سخت گیریوں سے بیزار تھے۔ ایسے عزت کے معاملہ میں مخبر کا کام کرنے سے گریز کرتے تھے۔ پر کسی قسم کی شہادت نہ ہونے پر بھی زبانِ خلق نے گوپی ناتھ کو مجرم قرار دے دیا تھا۔ اور اب اس فیصلہ کی کہیں اپیل

نہ تھی۔

اُدھر لالہ صاحب نے اُسی دن سے آنندی کے یہاں آنا جانا ترک کر دیا۔ دو ہفتے تک وہ غریب کسی طرح کنیا پاٹ شالا میں رہی۔ پندرھویں دن انتظامیہ کمیٹی نے اس کے نام برطرفی کا پروانہ بھیج دیا۔ ایک مہینہ کی رسمی اطلاع دینی بھی ضروری نہ سمجھی۔ بدنصیب عورت، ننھا سا نیم جاں بچہ گود میں لئے ایک تنگ مکان میں چلی گئی۔ اور زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ بچہ کمزور، خود بیمار۔ نہ کوئی تیماردار۔ نہ غمگسار۔ محض ایک مہری مل گئی جو اس کی حالت پر ترس کھا کر اس کے برتن دھو دیا کرتی تھی۔ بچاری بچہ کو چھاتی سے لگاتے رات رات بھر بیٹھ کر گذارتی۔ عجب مصیبت کا سامنا تھا۔ پر واہ رے صبر، اور توکل اور تحمل، لالہ گوپی ناتھ سے نہ زبان پر شکایت تھی۔ نہ دل میں۔ سوچتی موجودہ حالتوں میں انہیں مجھ سے بے اتفاقی کرنی ہی چاہیئے تھی۔ اس کے سوا اور کیا علاج تھا۔ ان کی رسوائی سے شہر کو کتنا بڑا نقصان ہوتا۔ گو اب بھی کتنے ہی آدمیوں کو ان پر شبہ ہے۔ مگر کوئی ان پر علانیہ الزام لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ رہی میں۔ میری ہستی ہی کیا میری بدنامی سے دنیا کو کیا نقصان۔

تین مہینے گذر گئے تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آنندی سوامی بھیدا نند کی ایک کتاب کا ترجمہ کر رہی تھی۔ اب وہ بچہ کے سو جانے پر ترجمہ کیا کرتی تھی۔ معاش کی کوئی اور صورت نہ تھی۔ دفعتہً کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا وہ چونک پڑی۔ دبے پاؤں دروازہ پر جا کر سننے لگی۔ لالہ گوپی ناتھ کی آواز معلوم ہوئی۔ فوراً دروازہ کھول دیا۔ گوپی ناتھ داخل ہوئے اور سوتے ہوئے

بچہ کو پیار کی نظروں سے دیکھتے ہوتے بولے۔ آنندی میں تمہیں منہ دکھانے کے لایق نہیں ہوں میں اپنے کو اتنا بودا۔ اتنا کم ہمت۔ اتنا بے غیرت نہ سمجھتا تھا۔ پر میرا بوداپن۔ میری بے غیرتی، اور بے شرمی مجھے بدنامی سے نہ بچا سکی میری بدنامی جو کچھ ہو سکتی تھی ہو چکی۔ میری ذات سے چلنے والی تحریکات کو جو نقصان پہنچنا تھا۔ وہ پہنچ چکا۔ اب غیر ممکن ہے کہ میں پبلک کو پھر اپنا منہ دکھاؤں اور نہ اب قوم ہی مجھ پر اعتبار کر سکتی ہے۔ باوجود اس کے مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے۔ کہ اپنے فعل کی ذمہ داری اپنے سر لوں میں پہلے سوسائٹی کی قیدوں کی شمہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا۔ پر اب قدم قدم پر اس کے خوف سے میری روح فنا ہو جاتی ہے لعنت ہے مجھ پر کہ تمہارے اوپر اتنی اُفتاد پڑیں تمہیں بیماری اور عسرت اور رسوائی کا یوں مقابلہ کرنا پڑے۔ تم پر ایسی ایسی کٹھن گھڑیاں گذریں اور میں یوں الگ الگ رہوں۔ گویا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کہ اس پر کیا گزرتی تھی۔ کتنی ہی بار یہاں آنے کا ارادہ کیا۔ اور پھر ہمت ہار گیا۔ اب مجھ پر روشن ہو گیا کہ میری ساری فلاسفی نمائش تھی۔ مجھ میں قوتِ عمل معدوم ہے میں محض اصولوں کا ایک دفتر ہوں محض مستعار خیالات کا ایک تودہ بے جان، بے حس۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تم سے الگ رہنا۔ میرے لئے عذاب ہے۔ تم سے دُور رہ کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اپنے پیارے بچہ کو ایک بار دیکھنے کے لئے میرے دل میں کتنی بار گدگدی سی ہوئی ہے۔ پر یہ اُمید کرنے کی جرأت کیونکر کروں کہ میرے اخلاقی ضعف کا ایسا دل شکن ثبوت پانے کے بعد تم مجھ سے نفرت نہیں کرنے لگی ہو۔

آنندی نے باچشم تر کہا۔ سوامی آپ ایسا خیال کر کے مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔

میں ایسی نادان نہیں ہوں کہ محض اپنی آسائش اور اطمینان کے لئے آپ کے نام نیک میں داغ لگاؤں۔ میں آپ کو اپنا دیوتا سمجھتی ہوں یہی میری سب سے بڑی تمنا ہے۔ آپ مجھے ایک بار اسی وقت روزانہ درشن دے دیا کریں۔

گوپی ناتھ اس طفلانہ بھولے پن پر شرمسار ہو گئے۔ جی چاہا کہ شادی اور بیاہ کی بے معنی قیدوں کو توڑ دوں۔ اس دفترِ بے معنی کو غرق مئے ناب کر دوں۔ اپنا گھر بناؤں۔ آنندی اس گھر کی دیوی بنے۔ بچہ اُس کے صحن میں کھیلے۔ اس کے رُخ روشن سے یہ تیرہ و تار کی زندگی روشن کر دوں۔ مگر ایک ہی لمحہ میں یہ جوشِ غیرت پھر فنا ہو گیا۔ رسوائی کا خوف پھر دل پر مسلط ہو گیا۔ فلسفہ نے پھر کوتہ عملی کے سامنے سر جھکا دیا۔ نیک نامی کا خوان شیریں زمین پر گر کر خاک میں مل چکا تھا۔ پر دل چیونٹی کی طرح پھر انہیں خاک آلودہ ریزہ ہائے شکر سے جا چمٹا۔

اس واقعہ کو پندرہ سال گذر گئے ہیں۔ اور اب بھی لالہ گوپی ناتھ روزانہ رات کو یکہ و تنہا آنندی کے کمرہ میں بیٹھے نظر آ سکتے ہیں۔ وہ نام پر جان دیتے ہیں۔ آنندی پریم پر۔ بدنام دونوں ہیں لیکن آنندی کے ساتھ لوگوں کو ہمدردی ہے۔ گوپی ناتھ سب کی نظروں سے گر گئے ہیں۔ ہاں ان کے قریبی دوست اس واقعہ کو تقاضہ بشری سمجھ کر اب بھی ان کی عزت کرتے ہیں لیکن پبلک اتنی متحمل نہیں ۔

خودی

مُنّی جس وقت دلدار نگر میں آئی۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہ تھی۔
وہ بالکل اکیلی تھی۔ ماں باپ دونوں نامعلوم۔ مر گئے۔ یا کہیں پردیس چلے گئے تھے
مُنّی صرف اتنا جانتی تھی۔ کہ کبھی ایک دیوی اُسے گود میں کھلایا کرتی تھی۔ اور ایک
دیوتا اُسے کندھے پر لے کر کھیتوں کی سیر کرایا کرتا تھا۔ پر وہ ان باتوں کا ذکر
کچھ اس طرح کرتی تھی۔ گویا اس نے خواب دیکھا ہو۔ خواب تھا یا واقعہ اس کا
اُسے علم نہ تھا۔ جب کوئی پوچھتا تیرے ماں باپ کہاں گئے؟ تو وہ بیچاری کوئی
جواب دینے کے بجائے رونے لگتی۔ اور یوں ہی ان سوالوں کو ٹالنے کے لئے
ایک طرف ہاتھ اُٹھا کر کہتی۔ اوپر کبھی آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی وہاں، اس
اوپر، اور وہاں سے اس کا مطلب کیا تھا؟ یہ کسی کو معلوم نہ ہوتا۔ شاید یہ مُنّی
کو خود ہی معلوم نہ تھا۔ بس ایک دن لوگوں نے اُسے ایک پیڑ کے نیچے کھیلتے دیکھا اور
اس سے زیادہ اس کی بابت کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔
لڑکی کی صورت بہت پیاری تھی۔ جو اُسے دیکھتا۔ موہ جاتا۔ اُسے کھانے پینے
کی فکر نہ رہتی تھی۔ جب کوئی بُلا کر کچھ دیتا۔ وہیں کھا لیتی۔ اور پھر کھیلنے لگتی۔ شکل و

صورت سے وہ کسی اچھے گھر کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ غریب سے غریب گھر میں بھی اس کے کھانے کو دو لقمے اور سونے کو ایک ٹاٹ کے ٹکڑے کی کمی نہ تھی۔ وہ سب کی تھی۔ اس کا کوئی نہ تھا۔

اس طرح کچھ دن بیت گئے مُنّی اب کچھ کام کرنے کے قابل ہو گئی۔ کوئی کہتا ذرا جا کے تالاب سے یہ کپڑے تو دھو لا مُنّی بے عذر کپڑے لیکر چلی جاتی لیکن راستہ میں کوئی اُسے بلا کر کہتا۔ بیٹی! کنوئیں سے دو گھڑے پانی تو کھینچ لا۔ تو وہ کپڑے وہیں رکھ کر گھڑے لے کر کنوئیں کی طرف چل دیتی۔ کوئیں پر کوئی کہہ دیتا۔ ذرا کھیت سے جا کر تھوڑا سا ساگ تو لے آ۔ اور مُنّی گھڑے وہیں رکھ کر ساگ لینے چلی جاتی۔ پانی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی۔ کنوئیں پر جا کر دیکھتی ہے تو گھڑے رکھے ہوئے ہیں۔ وہ مُنّی کو گالیاں دیتی ہوئی کہتی۔ آج سے اس کل موہی کو کچھ کھانے کو نہ دوں گی کپڑے کے انتظار میں بیٹھی ہوئی عورت اس کی راہ دیکھتے دیکھتے تھک جاتی اور غصہ میں تالاب کی طرف جاتی۔ تو راستہ میں کپڑے پڑے ہوئے ملتے۔ تب وہ بھی اسے گالیاں دے کر کہتی۔ آج اسے کچھ کھانے کو نہ دوں گی اس طرح مُنّی کو کبھی کبھی کچھ کھانے کو نہ ملتا اور تب اسے بچپن یاد آتا۔ جب وہ کچھ کام نہ کرتی تھی۔ اور لوگ اسے بلا کر کھانا کھلا دیتے تھے۔ وہ سوچتی کس کا کام نہ کروں جسے جواب دوں وہی ناراض ہو جائیگا۔ میرا اپنا کون ہے؟ میں تو سب کی ہوں۔ اس غریب کو یہ نہ معلوم تھا کہ جو سب کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کا نہیں ہوتا۔ وہ دن کتنے اچھے تھے۔ جب اُسے اپنے کھانے پینے کی، اور کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پروا نہ تھی بدبخت سیاہ بن بھی بچپن کا وہ زمانہ پیین کا تھا۔

کچھ دن اور گذرے۔ مُنّی جوان ہوگئی۔ اب تک وہ عورتوں کی تھی۔ اب مردوں کی ہوگئی۔ وہ سارے گاؤں کی معشوقہ تھی۔ پر کوئی اس کا محبوب نہ تھا۔ سب اس سے کہتے تھے۔ میں تم پر مرتا ہوں۔ تمہارے فراق میں تارے گنتا ہوں۔ تم میرے دل و جان کی مُراد ہو۔ پر اس کا سچا محبوب کون ہے؟ اس کی اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی اس سے یہ نہ کہتا تھا۔ کہ تو میری رنج و غم کی شریک ہو جا۔ سب اس سے اپنا خانۂ دل آباد کرنا چاہتے تھے۔ سب اُس کی نگاہ پر، ایک تبسم زیرِ لب پر قربان ہونا چاہتے تھے۔ پر کوئی اس کی بانہہ پکڑنے والا۔ اس کی لاج رکھنے والا نہ تھا۔ وہ سب کی تھی۔ اس کی محبت کے دروازے سب پر کھلے ہوتے تھے۔ پر کوئی اس پر اپنا قفل نہ ڈالتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا کہ یہ اس کا ہے اور کسی کا نہیں۔

وہ بھولی بھالی لڑکی جو ایک دن نہ جانے کہاں سے بھٹک کر آگئی تھی اب اس گاؤں کی ملکہ تھی۔ جب وہ اپنا فراخ سینہ اُبھار کر۔ غرور اور حسن سے گردن اٹھائے پُر نزاکت سے لچکتی ہوئی چلتی۔ تو منچلے نوجوان دل تھام کر رہ جاتے۔ اس کے پیروں تلے آنکھیں بچھاتے۔ کون تھا جو اس کے ایک اشارے پر اپنی جان نہ نثار کر دیتا یہ یتیم لڑکی۔ جسے کبھی گڑیاں کھیلنے کو نہ ملیں۔ اب دلوں سے کھیلتی تھی۔ کسی کو مارتی تھی کسی کو جلاتی تھی۔ کسی کو ٹھکراتی تھی۔ کسی کو تھپکیاں دیتی تھی۔ کسی سے روٹھتی تھی۔ کسی کو مناتی تھی۔ اس کھیل میں اسے ایک سفاکانہ مزا آتا تھا۔ اب پانسہ پلٹ گیا تھا۔ پہلے وہ سب کی تھی۔ کوئی اس کا نہ تھا۔ اب سب اس کے تھے۔ وہ کسی کی نہ تھی۔ اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ کہیں نہ ملتی تھی۔ کسی میں وہ ہمت نہ تھی۔ جو اس سے کہتا۔ آج سے تو میری ہے۔ اس پر دل نثار کرنے والے بہتیرے تھے۔ سچا رفیق ایک بھی نہ تھا۔ اصل

میں وہ ان آشفتہ سروں کو حقیر سمجھتی تھی۔ کوئی اس کی محبت کے قابل نہ تھا۔ ایسے پست ہمتوں کو وہ کھلونوں سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی جس کا مارنا اور جلانا ایک دلچسپ مشغلہ سے زیادہ نہیں۔

جس وقت کوئی نوجوان مٹھائیوں کے خوان اور پھولوں کے ہار لئے اس کے سامنے آ کھڑا ہو جاتا۔ تو اس کا جی چاہتا۔ منہ نوچ لوں۔ اسے وہ چیزیں زہر ہلاہل سی لگتیں۔ ان کی جگہ وہ رُوکھی روٹیاں چاہتی تھی سچی محبت میں ڈوبی ہوئیں۔ زیوروں اور اشرفیوں کے انبار اُسے بچھو کے ڈنگ سے لگتے۔ اس کی جگہ وہ سچے دل سے نکلی ہوئی باتیں چاہتی تھی۔ جن میں اُلفت کی بُو اور خلوص کا نغمہ ہو۔ اسے رہنے کو محل ملتے تھے۔ پہننے کو ریشم کھانے کو غذائے لطیف۔ پر وہ ان چیزوں کی طالب نہ تھی وہ طالب تھی۔ پھونس کے جھونپڑے۔ موٹے جھوٹے گاڑھے اور رُوکھے سُوکھے کھانے کی۔ اُسے اثبات رُوح سوز سے نفیٔ رُوح پرور کہیں زیادہ مرغوب تھی فضا کے مقابلہ میں کنج قفس زیادہ مطلوب!

۲

ایک دن ایک پردیسی گاؤں میں آنکلا۔ بہت ہی کم رو خستہ حال آدمی تھا۔ ایک پیڑ کے نیچے ستّو کھا کر لیٹا ہوا تھا۔ دفعتہً منی ادہر سے جانکلی۔ مسافر کو دیکھ کر بولی "کہاں جاؤ گے؟"

مسافر نے بے رُخی سے جواب دیا "جہنم"

مُنی نے مسکرا کر کہا۔ کیوں۔ کیا دُنیا میں جگہ نہیں،

"اوروں کے لئے ہوگی۔ میرے لئے نہیں"

"دل پر کوئی چوٹ لگی ہے؟"

مسافر نے زہر خند کر کے کہا۔ اور بدنصیبوں کی تقدیر میں کیا ہے! رونا، دھونا۔ اور ڈوب مرنا۔ یہی ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ پہلی دو منزلیں تو طے کر چکا۔ اب تیسری منزل اور باقی ہے۔ کوئی دن وہ بھی پوری ہو جائے گی۔ ایشور نے چاہا تو بہت جلد!

یہ ایک چوٹ کھائے ہوئے دل کے الفاظ تھے۔ ضرور اس کے پہلو میں دل ہے۔ ورنہ غیرت کہاں سے آتی۔ منی بہت دنوں سے دل کی تلاش کر رہی تھی۔ بولی کہیں اور وفا کی تلاش کیوں نہیں کرتے۔

مسافر نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ میری تقدیر میں نہیں۔ ورنہ میرا کیا بنا بنایا آشیانہ اُجڑ جاتا۔ دولت میرے پاس نہیں۔ حسن میرے پاس نہیں پھر وفا کی دیوی مجھ پر کیوں مہربان ہونے لگی؟ پہلے سمجھتا تھا۔ وفا دل کے بدلے ملتی ہے۔ اب معلوم ہوا۔ اور جنسوں کی طرح وہ بھی زر و جواہر سے خریدی جا سکتی ہے۔

منی کو معلوم ہوا۔ میری نظر دل نے دھوکا کھایا تھا۔ مسافر سیاہ فام نہیں صرف سانولا تھا۔ اس کے خط و خال بھی اسے دلاویز معلوم ہوتے۔ بولی۔ نہیں یہ بات نہیں تمہارا پہلا خیال صحیح تھا۔

یہ کہہ کر منی چلی گئی۔ اس کے دل کے جذبات اس کی قوتِ ضبط سے باہر ہو رہے تھے۔ مسافر کسی خیال میں محو ہو گیا۔ وہ اس حسینہ کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کیا سچ مچ یہاں وفا ملے گی۔ کیا یہاں بھی تقدیر فریب نہ دیگی۔

مسافر نے رات اُسی گاؤں میں کاٹی۔ وہ دوسرے دن بھی نہ گیا۔ تیسرے دن

اُس نے ایک پھونس کا جھونپڑا کھڑا کیا۔ مُنّی نے پوچھا یہ جھونپڑا کس کیلئے بناتے ہو؟

مسافر نے کہا جس سے وفا کی اُمید ہے۔

"چلے تو نہ جاؤ گے۔"

"جھونپڑا تو رہے گا!"

"خالی گھر میں بھوت رہتے ہیں"

"اپنے پیارے کا بھوت بھی پیارا ہوتا ہے۔"

دوسرے دن سے مُنّی اس جھونپڑے میں رہنے لگی۔ لوگوں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا۔ مُنّی اس جھونپڑے میں نہیں رہ سکتی۔ وہ اس بھولے مسافر کو ضرور دغا دے گی۔ یہ عام خیال تھا۔ لیکن مُنّی پھولی نہ سماتی تھی۔ وہ کبھی اتنی حسین نظر آئی تھی۔ نہ اتنی خوش۔ اُسے ایک ایسا انسان مل گیا تھا جس کے پہلو میں دل تھا۔

۳

لیکن مسافر کو دوسرے ہی دن یہ فکر پیدا ہوئی۔ کہیں یہاں بھی وہ روزِ سیاہ نہ دیکھنا پڑے جس میں وفا کہاں؟ اسے یاد آیا۔ پہلے بھی اس قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ ایسے ہی عہد و پیمان ہوتے تھے۔ مگر ان کچے دھاگوں کو ٹوٹتے کتنی دیر لگی؟ وہ دھاگے کیا پھر نہ ٹوٹ جائیں گے؟ اس کی عارضی مسرت کا دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ اور پھر وہی مایوسی دل پر مسلط ہو گئی۔ اس مرہم سے بھی اُس کے جگر کا زخم نہ بھرا۔ تیسرے دن وہ تمام دن مغموم اور متفکر بیٹھا رہا۔ اور چوتھے دن وہ لاپتہ ہو گیا۔ اس کی یادگار صرف اس کی پھوس کی جھونپڑی رہ گئی۔

مُنّی دن بھر اس کی راہ دیکھتی رہی۔ اسے اُمید یہ تھی۔ وہ ضرور آئیں گے۔ لیکن

مہینوں گذر گئے۔ اور مسافر نہ لوٹا۔ کوئی خط بھی نہ آیا۔ لیکن مُنّی کو اُمید تھی وہ ضرور آئیں گے۔

سال گذر گیا۔ درختوں میں نئی نئی کونپلیں نکلیں۔ پھول کھلے۔ پھل لگے۔ کالی گھٹائیں آئیں بجلی چمکی۔ یہاں تک کہ سرما بھی گذر گیا۔ اور مسافر نہ لوٹا۔ مگر مُنّی کو اب بھی اس کے آنے کی امید تھی۔ وہ ذرا بھی متفکر نہ تھی۔ وہ ذرا بھی خائف نہ تھی۔ وہ دن بھر مزدوری کرتی۔ اور شام کو جھونپڑے میں پڑ رہتی۔ لیکن وہ جھونپڑا اب ایک محفوظ قلعہ تھا۔ جہاں عشاق کی بھی پاپئے نگاہ لنگ ہو جاتی تھی۔

ایک دن وہ سر پر لکڑی کا گٹھا لئے چلی آتی تھی۔ ایک رسیا نے چھیڑ ملنائی کی۔ مُنّی کیوں اپنے نازک جسم کے ساتھ یہ ستم کرتی ہو؟ تمہاری ایک نگاہ کرم پر اس لکڑی کے برابر سونا صدقے کر سکتا ہوں۔

مُنّی نے رُوح شکن حقارت کے ساتھ کہا۔ تمہارا سونا تمہیں مبارک ہو۔ یہاں اپنی محنت کا بھروسہ ہے۔

کیوں اتنا اتراتی ہو۔ اب وہ لوٹ کر نہ آئیگا۔

مُنّی نے اپنے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ وہ گیا کہاں۔ جو لوٹ کر آئیگا میرا ہو کر پھر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ وہ تو میرے سینہ میں بیٹھا ہُوا ہے۔

اس طرح ایک دن ایک عاشق تن نے کہا۔ تمہارے لئے میرا محل حاضر ہے اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں کیا پڑی ہو۔

مُنّی نے غرور کے ساتھ کہا۔ اس جھونپڑے پر ایک لاکھ محل نثار ہیں۔ یہاں میں نے وہ چیز پائی ہے جو اور کہیں نہ ملی تھی۔ اور نہ مل سکتی ہے۔ یہ جھونپڑا نہیں ہے۔ میرے پیارے کا دل ہے!

اس جھونپڑے میں مُنّی نے ستّر سال کاٹے۔ مرنے کے دن تک اُسے مسافر کے لوٹنے کی اُمید تھی۔ اس کی آخری نگاہیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خریداروں میں کچھ تو مر گئے۔ کچھ زندہ ہیں۔ مگر جس دن سے وہ ایک کی ہو گئی۔ اُسی دن سے اس کے چہرہ پر وہ نورانی جلوہ نمودار ہوا جس کی طرف تاکتے ہی نگاہ ہوس بے نُور ہو جاتی تھی۔ خودی جب بیدار ہو جاتی ہے۔ تو دل کی کمزوریاں اس کے قریب آتے ڈرتی ہیں ٭

لال فیتہ

ذہانت کسی طبقہ کی میراث اور کسی اصول وراثت کی مطیع نہیں۔ مسٹر ہری بلاس اس کی مجسم دلیل تھے۔ وہ ذات کے کرمی تھے۔ آبائی پیشہ زراعت تھا۔ مگر بچپن ہی سے ان کا شوق تعلیم دیکھ کر والدین نے مصلحت سے کام لیا۔ انہیں ہل میں نہ جوتا۔ خود موٹا کھاتے تھے موٹا پہنتے تھے۔ اور موٹے کام کرتے تھے لیکن ہری بلاس کے لئے مہین چیزوں کی کمی نہ تھی۔ باپ لڑکے کو رامائن پڑھتے دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کے پاس سمن، چٹھیات یا لگان کی رسیدیں پڑھوانے آتے۔ تو اس کا سر غرور سے اونچا ہو جاتا تھا۔ لڑکے کے پاس ہونے کی خوشی اور فیل ہونے کا غم اُسے لڑکے سے بھی زیادہ ہوتا تھا اور اُس کے انعامات دیکھ کر تو اس کا دماغ عرش معلے پر جا پہنچتا تھا۔ ہری بلاس کا نشہ علم ان ہواؤں سے اور بھی تیز ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ابتدائی مرحلے طے کرتے ہوئے میٹریکولیشن تک پہنچے۔ بوڑھے رام بلاس نے سمجھا تھا۔ اب فصل کاٹنے کے دن آئے جب معلوم ہوا کہ یہ علم کی انتہا نہیں بلکہ آغاز ہے۔ تو اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ مگر ہری بلاس کا شوق طلب اس گرمی اور سردی سے مستغنی تھا۔ اس عزم قوی کے ساتھ جو اکثر نادار لیکن ذہین طلبا کا مابہ الامتیاز ہے۔ وہ کالج میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ وہ ایک رئیس کے لڑکے کو پڑھا کر تعلیمی مصارف نکال لیا کرتا تھا۔ مگر وقتاً فوقتاً اُسے کمیشست

رقموں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس کا بار رام بلاس پر تھا۔ غریب اب ضعیف ہو رہا تھا اور کھیتی مشقت کا دوسرا نام ہے کبھی موقعہ پر سینچائی نہ کر سکتا۔ کبھی وقت پر جتائی نہ ہو سکتی۔ فصلیں خراب ہو جاتیں۔ مگر ہری بلاس کی ضرورتوں کو زاہدانہ توکل کے ساتھ پورا کرتا تھا۔ کچھ اراضی بیع کرنی پڑی۔ کچھ رہن ہو گئی۔ کچھ قرضہ کی علت میں نیلام ہو گئی۔ ہری بلاس کا ایم اے۔ اس کی جائداد کا مرثیہ تھا۔ حسن اتفاق سے ملازمت کے دروازہ پر اس ناسزا انتخاب کا پہرہ نہ تھا۔ ہری بلاس مقابلہ کے امتحان میں شریک ہوئے۔ کامیابی یقینی تھی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ کا منصب ہاتھ لگا۔ رام بلاس نے جب یہ خبر سُنی۔ تو دیوانوں کی طرح دوڑا ہوا ٹھاکر دوارہ میں گیا۔ اور ٹھاکر جی کے پیروں پر گر پڑا۔ اور دوسرے ہی دن سے جانے کہاں غائب ہو گیا۔ حقیقتاً خواب ماسے بھی زیادہ ہوشربا تھی۔

۲

ہری بلاس میں طباعی کے ساتھ حُسنِ طبع کا میل ہو گیا تھا۔ صاف گو شیریں زبان۔ غریب دوست تھے۔ ان کے اوصاف کا سب سے نمایاں پہلو اُن کی حق پسندی تھی۔ آئین کے دائرے سے جو بھر بھی نہ ٹلتے تھے۔ رعایا ان سے دبتی تھی۔ پر انہیں پیار کرتی تھی۔ حکام ان کی عزت کرتے تھے۔ پر دلاً ان سے بدظن رہتے تھے۔

انھوں نے سیاسیات کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ اس شعبہ سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ ان کا افسر قانون تھا۔ شخصی اور ذاتی احکام کی تعمیل انھوں نے کبھی نہیں کی۔ اُسے وہ اپنا فرض نہ سمجھتے تھے۔ افسروں کو خوش ضرور رکھنا چاہتے تھے لیکن اسی حد تک کہ انہیں قانون کے پاک دائروں سے باہر نہ نکلنا پڑے۔

ملازمت کے پانچ سال گذر چکے تھے۔ وہ متھرا میں تعینات تھے۔ ٹھاکر اجیت سنگھ کے گھر ڈاکہ پڑا۔ پولیس کو اسامیوں پر شبہ ہوا کئی گاؤں کے اسامی ماخوذ ہوتے۔ شہادتیں تیار ہوئیں۔ اور استغاثہ شروع ہوگیا۔ بیچارے کسان ناکردہ گناہ تھے۔ حاکم ضلع کے پاس فریاد لے کر دوڑے لیکن حاکم ضلع ٹھاکر صاحب کے منّت شناس تھے۔ سال میں دو چار بار ان کے یہاں دعوتیں کھاتے۔ ان کے علاقہ میں شکار کھیلتے۔ ان کے موٹر، فٹن پر سیر کرتے۔ وہ اسامیوں کی اس جسارت پر برہم ہو گئے۔ انہیں سخت سُست کہہ کر دتکار دیا۔ شعلہ اور بھی مشتعل ہوا۔ سارے علاقہ میں آگ لگ گئی۔ مسٹر ہری بلاس کے اجلاس میں استغاثہ پیش ہوا۔ صاحب بہادر نے انہیں بنگلہ پر بُلایا۔ اور اس معاملہ میں انصاف مصلحت آمیز سے کام لینے کی تاکید کی۔ ہری بلاس نے بڑے غور سے مقدمہ کی سماعت کی۔ معلوم ہوگیا۔ شہادتیں مصنوعی ہیں۔ ٹھاکر صاحب کی زیادتی معلوم ہوتی۔ ملزموں کو بری کر دیا۔ حاکم ضلع کو یہ فیصلہ ناگوار گذرا۔ ان کی رپورٹ کی۔ تبادلہ ہوگیا۔

اسی طرح ایک بار انہیں نیچ ذاتوں کی حمایت کرنے کا یہی صلہ ملا۔ لکھنؤ میں مقیم تھے۔ وہاں دیہاتی مدارس میں نیچ ذاتوں کے لڑکے داخل نہ ہونے پاتے تھے۔ کچھ تو مدرسوں کو احتراز تھا۔ ان سے زیادہ طلباء کے والدین کو۔ ہر بلاس دورہ پر گئے تو شکایت سُنی۔ مدرسوں کو تنبیہہ کی۔ کئی آدمیوں پر جرمانہ کیا۔ ان کے پرگنہ کے زمینداروں نے یہ کیفیت دیکھی تو بگڑے۔ گمنام عرضیاں فرضی شکایات سے بھری ہوئیں۔ حکام کے پاس پہنچنے لگیں۔ تحصیلداروں نے زمینداروں کو اور بھی مشتعل کیا۔ کرمی ہو کر ایسے منصب پر مامور ہو۔ یہ سبھی کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی مدرسے بند ہو گئے۔ کئی مدرسوں نے استعفے پیش کر دیئے۔ ہری بلاس کی خاصی بدنامی ہو

گئی۔ حاکم ضلع نے ان کا وہاں رہنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اور ان کا تبادلہ کرا دیا۔ تنزل کے ساتھ۔

ان نارسائیوں کے باوجود ہری بلاس کا سا دیانت پرور۔ فرض شناس ملازم سارے صوبہ میں نہ تھا۔ ان کے ذہن میں شاہی اعلانوں کے وہ پُرشکوہ الفاظ نقش ہجر ہو گئے تھے۔ جن میں قانون کے احترام اور حق کی حمایت کو نظام سیاست کا مدار قرار دیا گیا ہے۔ قریبی حکام کی ناشناسیوں کا اس نقش اطاعت پر مطلق اثر نہ پڑتا تھا۔ یہ اُسی دَور کی برکت ہے۔ کہ میں ایسے منصب پر مامور ہوں۔ ورنہ میرے لئے یہ موقع کہاں تھے؟ زیردستوں اور بیکسوں کی اتنی حمایت کب ہوئی۔ مساوات کے اُصول پر کب اس طرح عمل ہُوا۔ تعلیم کو یہ فروغ کب حاصل ہُوا۔ یہی خیالات تھے جن سے متاثر ہو کر دورانِ جنگ یورپ میں مسٹر ہری بلاس نے ہر ایک ممکن طریق سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ اور رائے بہادری کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

۳

کرسمس کے دن تھے۔ رائے ہری بلاس اپنے بڑے بیٹے شیو بلاس سے باتیں کر رہے تھے۔ جو لاہور میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ اور تعطیل منانے گھر آیا ہُوا تھا۔ اسی اثنا میں دو تین زمیندار صاحبان بھی آ گئے۔ اور شکار کی گفتگو شروع ہو گئی۔

ایک خانصاحب نے فرمایا حضور آج کل مرغابیاں خوب آئی ہوئی ہیں۔ شکار کا اچھا موقع ہے۔

دوسرے ٹھاکر صاحب بولے جس دن حضور چلنے کو کہیں۔ بیگار ٹھیک کر لئے

جائیں۔ دو تین ڈونگیاں بھی طے کر لی جائیں۔

شیو بلاس نے پوچھا۔ کیا ابھی آپ لوگوں کو بیگار ملتے جاتے ہیں۔

خانصاحب۔ جی ہاں ابھی تک تو مار پیٹ سے مل جاتے ہیں۔ اور ہمیں چاہیے نہ ملیں۔ پر حاکموں کے لئے تو محض حکم کی دیر ہے۔ ہاں آئندہ خیریت نہیں نظر آتی۔

ٹھاکر صاحب۔ جب سے کوئی لوگ بصرہ بھرتی ہوئے کے گئے تب سے کوؤں کا مجاج ناہیں ملت ہے۔ بات تک تو سنت ناہیں ہیں۔ اسے لڑائی ہم کا ملیا میٹ کے دیہیں۔

شیو بلاس۔ آپ لوگ مزدوری بھی تو بہت کم دیتے ہیں۔

ٹھاکر۔ ہجور پہلے دن بھر کے دوئی پیسہ دیت رہن۔ اب تو چار دیت ہیں۔

شیو بلاس۔ خوب! آپ چار پیسے تو مزدوری دیتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ آدمیوں کو غلام بنالیں۔ شہروں میں عام مزدوروں کی مزدوری ۸ سے کم نہیں۔

خانصاحب۔ حضور بجا ارشاد فرماتے ہیں۔ چار پیسے تو ایک آدمی کے لئے چینہ بھر کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ مگر رعایا جبر و تشدد کی ایسی عادی ہو گئی ہے کہ ہم چاہے ۸ ریومیہ ہی کیوں نہ دیں۔ پر بلا سختی کئے مخاطب ہی نہیں ہوتی۔ بیگار کا نام بُرا ہے ہاں یہ تو بتائیے حضور جو کالج اور مدرسے بند ہو گئے تھے۔ وہ ابھی کھلے یا نہیں سنتے ہیں لوگ۔ سرکاری عدالتوں کو توڑ کر قومی عدالتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کام کے لئے کروڑوں کے چندے ہو رہے ہیں۔

رائے صاحب کو معلوم تھا۔ کہ شیو بلاس کیا جواب دیں گے۔ ان کے سیاسی

خیالات سے واقف تھے۔ دونوں آدمیوں میں ان مسائل پر اکثر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔
لیکن انہیں یہ نہ منظور تھا۔ کہ ان زمینداروں کے رُوبرُو اپنے خیالات ظاہر کریں۔
اس میں ان کی سُبکی تھی۔ اور ان کے منصبی وقار کو بھی نقصان پہونچتا تھا۔ اس لئے
انہوں نے شیبو بلاس کو بولنے کا موقع نہ دیا۔ خود ہی بولے۔ میں تو اُسے جنون سمجھتا
ہوں۔ اور کچھ نہیں۔ لوگوں کو گمان ہے کہ ان کارروائیوں سے ہماری سرکار کو شکست
دیں گے۔ اسی خیال سے پنچایتیں۔ کانگرس کمیٹیاں۔ قومی مدارس قائم کئے جا رہے
ہیں لیکن لوگ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ کسی ملکی نظام کا مدار ہمیشہ حق اور انصاف پر
ہوتا ہے۔ اور جب تک ارباب حکومت ان اصولوں سے گریز نہ کریں سلطنت کا
زوال پذیر ہونا غیر ممکن ہے۔ ہماری سرکار نے ہمیشہ حق کو اپنا مطمح نظر رکھا ہے۔
ہر ایک فرقہ کو ہر ایک فرد کو اس حد تک قول و فعل کی آزادی ہے کہ اس سے کسی
دوسرے کو نقصان نہ پہنچے۔ یہی حق پسندی ہماری سرکار کی سب سے زبردست
معاون طاقت ہے اور کسی کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ سرکار نے جادۂ حق
سے جو بھر بھی انحراف کیا ہے۔

اتنے میں ڈاکیے نے خطوط کا پلندا لا کر ڈپٹی صاحب کے سامنے رکھ دیا۔
وہ پہلے سرکاری خطوط کھولنے کے عادی تھے۔ آج صرف ایک لفافہ سرکاری تھا۔
اُسے کھولا۔ تو اندر سے سُرخ فیتہ میں بندھا ہوا ایک سرکاری مراسلہ نکل پڑا۔ اُسے
غور سے پڑھنے لگے۔

۴

آدھی رات گذر گئی تھی۔ مگر مسٹر ہری بلاس ابھی تک کروٹیں بدل رہے تھے

سامنے میز پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اسی سُرخ فیتے والے مراسلے پر بار بار نگاہیں ڈالتے۔ اور پھر خیال میں ڈوب جاتے۔ وہ سُرخ فیتہ انہیں حق اور راستی کے خون میں رنگا ہوُا معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی قاتل کی غونباز آنکھیں تھیں جو ان کی طرف گھور رہی تھیں۔ یا ایک شعلہ سُرخ تھا۔ جو ان کے ضمیر اور احساس حق کو نگل جانے کے لئے ان کی طرف لپکا آتا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ اب تک میں سمجھتا تھا۔ کہ میرا کام انصاف کرنا ہے۔ اب معلوم ہو رہا ہے۔ کہ میں غلطی پر تھا۔ میرا کام انصاف کرنا نہیں انصاف کا خون کرنا ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں دیہاتوں میں اخبار بین لوگوں پر نگاہ رکھوں جو لوگ کسانوں کی حمایت پر آمادہ نظر آئیں۔ جو لوگ انہیں رسد اور بیگار دینے سے علانیہ یا اشارۃً روکیں ان کی تنبیہہ کروں۔ ان سادھو۔ سنیاسیوں سے باز پرس کروں جو عوام میں دہرم اُپدیش کرتے پھرتے ہیں۔ نہیں جن لوگوں کو چرخے اور کرگھے کے استعمال کی ترغیب دیتے ہوتے دیکھوں۔ جسے گاڑھے اور کھدر کے کپڑے پہنے ہوئے پاؤں۔ اس کا نام بھی اپنے روزنامچہ میں درج کروں۔ جو لوگ قومی مدارس کی امداد کریں۔ جو قومی مجلسوں میں شریک ہوں۔ نہیں۔ بلکہ ان پاک نفسوں کو بھی جو اپنی جان خطرہ میں ڈال کر وبا اور طاعون میں رعایا کی جان بچاتے ہیں۔ اور مفت دوائیں تقسیم کرتے پھرتے ہیں سرکشوں میں شمار کروں اور مسکرات کے معاملہ میں چون وچرا کرنے والوں کو فوراً شکنجہ میں کس دوں۔ خلاصہ یہ کہ مجھے قوم کے دوستوں اور قوم کے خادموں کا دُشمن بننا چاہئے۔

انہوں نے ایک بار پھر سُرخ فیتہ کی طرف دیکھا۔ جو پنکھے کے جھونکوں سے کسی مار آتشیں کی طرح اِدھر اُدھر رینگتا ہوُا معلوم ہوتا تھا۔ ہاں تو ایسی حالت میں

میرا کیا طرزِ عمل ہونا چاہئے۔ میں سرکار کا غلام ہوں۔ مگر حکومت کا رعب قائم کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ رعایا کی خدمت کرنے کیلئے۔ تو جب قوم اور سرکار کے مفاد میں اس قدر تباین ہے۔ تو میرے لئے اس کے سوا اور کیا تدبیر ہے۔ کہ اپنے تئیں اس شکنجہ کا پُرزہ نہ بننے دوں۔ میرا منصبی تعلق عارضی ہے۔ وطنی تعلق دائمی ہے۔

پھر کیا میں اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے ضمیر کا خون کروں۔ ایک تو وہ ہیں جو اپنے تئیں قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے طرح طرح کی اذیتیں جھیلتے ہیں۔ میں اپنے تئیں ان سے کہیں زیادہ قوم کا دوست سمجھتا تھا۔ ایک دیانت دار سرکاری ملازم کی ذات سے رعایا کو جتنا فیض پہنچ سکتا ہے۔ اتنا دس قومی جاں نثار ان سے ممکن نہیں لیکن جب سرکاری ملازمت میں قوم اور ملک کے خلاف کارروائی کرنا پڑے۔ تو اس سے بڑھ کر اور کیا ذلت ہو سکتی ہے کہ وہ پھر بھی اسکی ہوا خواہی کا دم بھرتا رہے۔ نہیں۔ نہیں میں ایسا نہ کرونگا۔

لیکن گذران کی کیا صورت ہے؟ اتنا سرمایہ بھی تو نہیں۔ کہ دو چار مہینے بھی فراغت سے بیٹھ سکوں۔ آہ! جن بچوں کو ناز و نعمت میں پالا۔ انہیں اب بینوائی کا شکار بننا پڑے گا۔ جو خاندان اب تک امیرانہ طریق پر بسر کرتا تھا۔ اُسے عسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خاندانی جائداد میری تعلیم کی نذر ہو چکی۔ نہیں اور کچھ نہ ہوتا۔ تو کاشتکاری ہی کرتا۔ کیسی قناعت کی زندگی تھی۔ پسینہ کی روٹی کھاتے تھے۔ اور مزے کی نیند سوتے تھے۔ تعلیم نے تکلفات کا عادی اور نمود کا غلام بنا دیا۔ غیر ضروری ضرورتوں کا خوگر ہو گیا۔ تہذیب کے نشہ نے ستیاناس کر دی۔ اب تو اس سادہ اور بے لوث زندگی کا خیال کرتے ہی روح فنا ہو جاتی ہے

افسوس! دل میں کیا کیا ارمان تھے۔ کیسے کیسے خیالی پلاؤ پکاتا تھا۔ شیبو بلاس کو ولایت بھیجنے کا قصد تھا۔ سنت بلاس وکالت کا فیصلہ کر چکا ہے۔ سری بلاس ابھی سے مجسٹریٹی کی دھن میں مست ہے۔ لڑکوں کو تو خیر ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا۔ وہ کسی نہ کسی طرح گذر کر ہی لیں گے۔ لڑکیوں کو کیا کروں؟ سوچا تھا۔ ان کی شادی اونچے خاندان میں اور بلا قید تفریق کروں گا۔ وہ سب آرزوئیں دل ہی میں رہی جاتی ہیں۔ نوکری تلاش کروں تو اتنی تنخواہ کہاں مل جاتی ہے۔ اور پھر رئیسوں کے دربار میں رسائی مشکل۔ سرکاری ملازمت سے دست کش ہونیوالے کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کسی نے از راہِ پرورش رکھ بھی لیا۔ تو ہمیشہ اس کی مزاج داری کرنی پڑے گی۔ جو کبھی نہ کیا۔ اس پہ اپنے تعلق کا مدار رہے گا۔ یہ ذلت اب کس سے برداشت ہوگی۔ پرماتما مجھے اس مخمصے سے نکالو۔ میرے ہاتھوں سے انصاف کا خون نہ کراؤ

۵

لال فیتہ کا مراسلہ آتے ہوتے ایک ہفتہ گذر گیا۔ رائے ہری بلاس نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ وہ ہر دم کچھ افسردہ خاطر رہتے۔ اجلاس بہت کم آتے۔ اور آتے بھی تو مقدمات کی تاریخیں ملتوی کر کے پھر چلے جاتے۔ لڑکوں اور لڑکیوں سے بھی بہت کم مخاطب ہوتے۔ بات چیت پر جھنجلا پڑتے۔ بیوی سے اپنے دقتوں کا ذکر کیا۔ لیکن وہ ترک ملازمت پر راضی نہ ہوتی۔ اور لڑکوں سے ذکر کرتے ہوتے انھیں بہت تامل ہوتا تھا۔ ان کی دل شکنی کا خیال مانع تھا۔ سرکار کے نیک ارادوں پہ اب اعتبار نہ تھا۔ اس کی ملازمت کو وہ اب ذریعہ

نجات نہ سمجھتے تھے۔ ملازمت کا ایک ایک لمحہ ان پر گراں گزرتا تھا۔ مگر اپنی بیکسی کا احساس کشمکش کا خاتمہ نہ ہونے دیتا تھا۔ کوئی ہنر کوئی پیشہ نہ جانتے تھے۔ جس پر تکیہ کر سکتے یہاں تک کہ معمولی خرید و فروخت بھی جو ہزاروں حرف ناشناسوں کا وسیلہ معاش ہے۔ ان کے لئے منزل ہفتخواں سے کم نہ تھی۔ وہ ملازمت کے سوا اپنے تئیں کسی دوسرے کام کے قابل نہ پاتے تھے۔ یہ مجبوری اور بھی سوہان رُوح ہو رہی تھی۔ غرض اور فرض کی الجھن میں پڑے ہوئے۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

آٹھویں دن انہیں خبر ملی۔ کہ قریب کے کسی موضع میں منشیات کی روک کے لئے کوئی پنچایت ہونے والی ہے۔ اُپدیش ہوں گے۔ بھجن گائے جائیں گے۔ اور نشہ بازوں سے تاوان لئے جانے کے مسئلہ پر بھی غور کیا جائے گا۔ وہ تسلیم کرتے تھے۔ کہ نشہ کا رواج ملک اور بالخصوص ادنےٰ طبقہ کے جان کا گاہک ہو رہا ہے اور اس نے انسداد کی کوشش ہمہ وجوہ قابلِ تعریف ہے۔ کئی سال قبل وہ صیغہ مسکرات کے کمشنر رہ چکے تھے۔ اس وقت وہ اس مسئلہ کو حاکمانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مسکرات کی تخفیف کو خفیہ سازی اور خفیہ فروشی کا مترادف سمجھتے تھے۔ ٹمپرنس ریفارمروں کی خیر سگالیاں انہیں گورنمنٹ کی بے جا مخالفت پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن زمانہ اور تجربہ کے ساتھ اس خیال میں بہت کچھ ترمیم ہو چکی تھی اس لال فیتہ والے عرصہ کے مطابق ان کا فرض تھا۔ کہ پنچایت کی کارروائیوں کو دیکھیں۔ اور اگر اسے ترک مسکرات کے لئے کسی کے ساتھ سختی یا بے جا دباؤ ڈالتے دیکھیں۔ تو اس کا تدارک کریں۔ یہ طرزِ عمل انہیں سخت ناگوار معلوم ہو رہا تھا

انسانی اور منصبی فرائض کی کشاکش میں پریشان بیٹھے ہوتے تھے۔ کہ حلقہ کا داروغہ پولیس کئی مسلح چوکیداروں کے ساتھ ان کی امداد کے لئے آپہنچا۔ ہری بلاس اس کی صورت دیکھتے ہی جل گئے۔ تحکمانہ انداز سے بولے۔ آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

سب انسپکٹر۔ حضور کو اس پنچایت کی اطلاع تو ملی ہی ہو گی۔ وہاں شر و فساد کا اندیشہ ہے حضور کی ہمراہی کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

ہری بلاس۔ مجھے اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ہاں آپ کی بے جا مداخلت سے فساد ہونا یقینی ہے۔

سب انسپکٹر نے حیرت سے دیکھ کر کہا میں تو حضور کے ہم رکاب رہونگا۔

ہری بلاس "آپ کو میرے ساتھ چلنے کی ضرورت نہیں"۔

سب انسپکٹر۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر کا تاکیدی پروانہ ملا ہے کہ حضور کی امداد کے لئے حاضر رہوں۔

ہری بلاس "میں آپ کے سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ وحشمتہٗ کا غلام نہیں ہوں"

سب انسپکٹر "تو میرے لئے کیا ارشاد ہوتا ہے"

ہری بلاس "آپ جا کر کچھ دنوں گھر بیٹھئے اور گناہوں کی تلافی کیجئے۔ امن عامہ کی بہت کچھ حفاظت کی۔ ڈاکے اور سرقے کا خوب انسداد کیا۔ غربا کا گلا بہت گھونٹا زندگی کے باقی دن یاد الٰہی کی نذر کیجئے۔ ممکن ہے اُس کے دربار تک جاتے جاتے اعمال کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔

یہ مجذوبانہ تقریر سُن کر سب انسپکٹر صاحب کچھ سٹ پٹا سے گئے۔ خیال

کیلیا تو ان حضرت نے آج شراب پی لی ہے۔ یا اور کوئی ایسا صدمہ آ پڑا ہے جس سے ان کے حواس میں فتور آ گیا ہے۔ سلام کیا۔ اور رخصت ہو گئے۔

ان الفاظ میں سٹر ہری بلاس کی روحانی کشمکش اور ان کا آخری فیصلہ دونوں مخفی تھے۔ یہ گویا ان کے فیصلہ کا اعلان تھا۔ دروغہ جی نے ادھر رخصتی سلام کیا۔ اور اُدھر ہری بلاس نے اپنا استعفےٰ لکھنا شروع کیا۔

۶

جناب من! میرا عقیدہ ہے کہ نظام سلطنت مشیت ایزدی کی ظاہری صورت ہے۔ اور اس کے قوانین بھی رحم۔ حق اور انصاف پر قائم ہے۔ میں نے پندرہ سال تک سرکار کی خدمت کی اور حتی الامکان اپنے فرائض کو دیانت داری سے انجام دیا۔ ممکن ہے حکام بعض موقعوں پر مجھ سے خوش نہ رہے ہوں۔ اس لئے کہ میں نے شخصی احکام کی اطاعت کو کبھی اپنا فرض نہیں سمجھا۔ جب کبھی میرے احساس قانون اور حکم حاکم میں تناقض ہوا۔ میں نے قانون کی پیروی کی۔ میں ہمیشہ سرکاری ملازمت کو خدمتِ ملک کا بہترین ذریعہ سمجھتا رہا لیکن مراسلہ نمبر...... مورخہ...... میں جو احکام نافذ کئے گئے ہیں۔ وہ میرے ضمیر اور اصول کے مخالف ہیں اور میرے خیال میں ان میں ناحق پروری کا اتنا دخل ہے۔ کہ میں اپنے تئیں ان کی تعمیل کے لئے کسی حالت میں آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ احکام رعایا کی جائز آزادی میں مخل اور ان کی سیاسی بیداری کے قاتل ہیں۔

ان حالات پر نظر کر کے میرا اس نظامِ حکومت سے تعلق رکھنا ملک اور قوم کی بیخ کنی کرنی ہے۔

دیگر حقوق کے ساتھ رعایا کو سیاسی جدوجہد کا حق بھی حاصل ہے۔ اور چونکہ گورنمنٹ اس حق کو پامال کرنے کے درپے ہے۔ لہذا میں ہندوستانی ہونے کے اعتبار سے یہ خدمت انجام دینے سے معذور ہوں۔ اور استدعا کرتا ہوں کہ مجھے بلا مزید تاخیر اس عہدہ سے سبکدوش کیا جائے۔

۷

احباب نے استعفا کی خبر سنی۔ تو ہری بلاس کو سمجھانے لگے۔ مگر وہ اپنے ارادہ پر ثابت رہے۔ استعفا داخل کر دیا۔ اب بھی لوگوں کو امید تھی۔ کہ شاید حکام اسے جلد منظور کریں لیکن دوسرے ہی دن تار کے ذریعہ سے منظوری آگئی۔ ہری بلاس بہت خوش ہوئے۔ علے الصباح خوش خوش دفتر گئے۔ اور ہنس ہنس کر چارج دیا مگر شام ہوتے ہوتے ان کی زندہ دلی غائب ہوگئی اور گوناگوں تفکرات نے آ گھیرا بزاز کے کئی سو روپے باقی تھے۔ ملازموں کی تنخواہیں باقی پڑی ہوئی تھیں۔ مکان کا کرایہ چھ مہینے سے نہ دیا تھا۔ حلوائی اور گوالے کا حساب بھی چکانا تھا۔ ان حساب داروں کا مجمع دیکھ کر ہری بلاس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ ماہوار ادائیگی کے ایسے عادی ہو گئے تھے۔ اور ایک معین تاریخ پر ایک معین رقم کا ہاتھ آ جانا ان کے لئے ایسا فطری عمل ہو گیا تھا۔ کہ آج دوران ماہ میں یہ حساب کتاب کرنا انہیں بلا سے جان معلوم ہو رہا تھا۔ اور وہ بھی تہی دستی کی حالت میں۔ مجبوراً سیونگ بنک سے روپے منگواتے۔ اور حساب بیباق کر دیا۔ یوں معمولاً وہ کچھ اور باقی ملا کر اپنے سلیقے کے مطابق روپے دیا کرتے تھے۔ لیکن آج حال اور باقی کی رقمیں مل کر اس طرح بڑھیں۔ جیسے صاف فرش اٹھا دینے سے نیچے خاک کا ایک انبار نظر آنے لگتا ہے

انہیں اب تک گمان بھی نہ ہوا تھا۔ کہ میں اس حد تک مقروض ہو گیا ہوں پیاس تک میں ایک تشویش ناک تخفیف ہو گئی۔ آخر ساز و سامان نیلام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اب انہیں رکھنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ دوسرے دن نیلام شروع ہو گیا۔ اور چیزیں ایک ایک کر کے ان سے ترک موالات کرنے لگیں۔ ہری بلاس برآمدے میں مغموم بیٹھے ہوئے اس خانہ تباہی کا نظارہ دیکھ رہے تھے کتنی ہی چیزیں ایک مدت سے ان کے پاس تھیں۔ اب ان کا جدا ہونا شاق گذرتا تھا۔ سب سے دل شکن وہ موقعہ تھا جب ان کا گھوڑا اور فٹن نیلام ہوتے۔ وہ اس نظارہ کے متحمل نہ ہو سکے۔ گھر میں گئے تو ان کی آنکھیں آب گوں تھیں سمترا نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ ناحق دل اتنا چھوٹا کرتے ہو۔ رنجیدہ ہونے کی کونسی بات ہے۔ یہ تو اور خوشی کی بات ہے کہ جس کام کے کرنے میں ادھرم ہوتا تھا۔ اس سے نجات ہو گئی۔ اب کسی کا گلا کاٹنے کے لئے کوئی تمہیں مجبور تو نہ کرے گا۔ روزی کا ایک یہی وسیلہ نہیں ہے۔ بھگوان نے منہ چیرا ہے تو آہار بھی دینگے آخر اپنے بھائی بندوں پر ظلم کرتے تو اس کا دوش پاپ ہمارے ہی بال بچوں پر نہ پڑتا۔ بھگوان کو کچھ اچھا ہی کرنا تھا۔ تبھی اس نے تمہارے من میں یہ بات ڈالی ہے۔

ہری بلاس کو ان باتوں سے گونہ تشفی ہوئی۔ پہلے بھی سمترا استعفا پر راضی نہ ہوتی تھی لیکن شوہر کی روحانی کشمکش کا خاتمہ کرنے کے ارادے نے اس کی قناعت اور توکل کو بیدار کر دیا تھا۔

ہری بلاس نے سمترا کی طرف عقیدت مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ جانتی ہو کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑینگی۔

سمترا۔ تکلیفوں سے کیا ڈرنا۔ دھرم کے لئے آدمی سب کچھ سہہ لیتا ہے۔ جان

تمک کی پرواہ نہیں کرتا۔ آخر ہمیں بھی تو ایشور کے دربار میں جانا ہے جب وہ پوچھتا۔ کہ تم نے اپنے سُکھ چین کے لئے اپنی آتما کا خون کیوں کیا تو اُسے کیا جواب دیتے۔

ہری بلاس۔ کیا بتاؤں۔ یہ پاک اعتقاد مجھ میں نہیں ہے۔ مجھے تو مادی تعلیم نے نفس اور خواہشات کا غلام بنا دیا ہے۔ ایشور پر سے بھروسہ ہی اُٹھ گیا۔ گو میں نے انہیں وجوہ سے استعفےٰ دے دیا ہے۔ لیکن مجھ میں وہ زندہ جاگتا ہوا ایمان نہیں ہے۔ جو انسان کو فنا فی الحق کر دیتا ہے۔ مجھے ابھی تک کچھ سُوجھ نہیں پڑتا۔ کہ آئندہ گذارن کی کیا صورت ہوگی؟ شیو بلاس اگر سال بھر اور تعلیم جاری رکھ سکتا۔ تو وہ ہاتھ پیر سنبھال لیتا۔ سنت بلاس کو ابھی کم سے کم تین سال تک سہارے کی ضرورت ہے۔ اور غریب سری نواس کی ابھی کوئی گنتی ہی نہیں۔ اب یہ بیچارے کہیں کے نہ رہینگے معلوم نہیں۔ دل میں کیا سمجھتے ہونگے؟

سمترا۔ اگر ایشور نے انہیں سمجھ دی ہے۔ تو اب وہ تمہیں اپنا پیارا باپ سمجھنے کے بدلے دیوتا سمجھتے ہونگے۔

رات کا وقت تھا۔ شیو بلاس اور اُس کے دونوں چھوٹے بھائی بیٹھے ہوئے انہیں معاملات کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔

شیو بلاس۔ اس وقت دادا کی حالت دیکھ کر ارادہ ہوتا ہے۔ کہ شادی نہ کروں۔ کئی بار جی چاہا کہ چل کر ان کی تشفی کروں لیکن ان کے رُوبرُو جاتے ہوئے مجھے خود رونا آتا ہے۔ آخر انہیں ہمیں لوگوں کی فکر ہے نہ۔ ورنہ اپنی کیا فکر تھی۔ چاہیں تو کسی کالج میں ملازمت کر سکتے ہیں۔ فلاسفی اور علم اقتصاد میں انہیں اچھا دسترس ہے۔

سنت نواس۔ آپ نے کالج سے اپنا نام خارج کرانے کی درخواست ناحق دیدی۔ ڈاکٹری کا صیغہ تو بُرا نہ تھا۔ آپ خانگی طور پر کام کر سکتے تھے۔ دادا سے بھی آپ نے نہ پوچھا۔ انہیں یہ خبر سُن کر سخت رنج ہو گا۔

شیو بلاس۔ اسی وجہ سے تو میں نے اب تک ان سے کہا نہیں۔ صیغہ کتنا ہی اچھا ہو۔ لیکن میں اسے معاش کا وسیلہ نہیں بنانا چاہتا۔ بس جو طے کر لیا ہے اسی پر قائم ہوں۔ کیوں تم میری مدد کرو گے نہ؟

سنت بلاس۔ میں تو ایم۔ اے کے قبل شاید ہی آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔ اس سال مجھے معاف ہی رکھئے۔ آئندہ سے کچھ نہ کچھ وقت ضرور آپ کے نذر کر دوں گا۔

شیو بلاس۔ ایم۔ اے سے تمہیں کیوں اتنا عشق ہے۔

سری بلاس۔ (شرارت آمیز تبسم کے ساتھ) ایم۔ اے کے معنی ہیں ماسٹر آف......

سنت بلاس۔ یہ میری بہت پُرانی آرزو ہے۔ اور اب منزلِ مقصود سے اس قدر قریب پہنچکر قدم ہٹانا نہیں چاہتا۔

شیو بلاس۔ اسکے بعد پھر وہی ایل ایل بی، کا معینہ دَور آئیگا۔ اور تم موٹے حروف کے ساتھ بورڈ لگا کر موکلوں سے دن کی لینا شروع کر دوگے۔

سنت بلاس۔ آپ تو اس اندازِ تحقیر سے کہہ رہے ہیں۔ گویا میں ایسا کروں تو کوئی شرمناک بات نہ ہوگی۔ بیشک مجھے یہ ہوس ہے۔ اور میں اپنے تئیں اس کے لئے قابلِ سرزنش نہیں سمجھتا۔ وکالت کے پیشہ سے مجھے عشق نہیں۔ چاہے ضرورت سے

ہوکر اسے اختیار ہی کیوں نہ کرنا پڑے لیکن ڈگری سے ضرور محبت ہے آج کل انسان کی رفعت ڈگریوں ہی پر منحصر ہے۔ ابھی تک شاید ہی کوئی ایسا آدمی ملا ہوگا جو اپنی علمی ڈگریوں سے دست بردار ہوگیا ہو۔ وہ حضرات بھی جو تعلیمی رفاقت کے پیشوا بنتے ہیں۔ اپنے ناموں کے پیچھے بڑی بڑی ڈگریوں کا چھلا لگانا معیوب نہیں سمجھتے۔ قومی مدرسوں اور کالجوں میں بھی انہیں حضرات کی قدر ہے۔ جو ولایت کی ڈگریاں پائے ہوتے ہیں۔ یہی ہماری قیمت کا معیار ہے۔ تو پھر میں ہی کیوں اپنے اوپر جبر کروں بُرا نہ مانئے گا۔ اخبار کے ابتدائی ہفتوں میں غالباً آپ بھی میرے مضامین ڈگریوں کے اظہار کے بعد ہی چھاپیں گے۔

شیلو بلاس۔ (نادم ہوکر) ہاں یار بات تو سچی کہتے ہو۔ اس کو روحانی غلامی کہتے ہیں۔

سنت بلاس۔ اپنی پالیسی تو آپ نے سوچ ہی لی ہوگی۔ اگر آپ نے بھی وہی آئین اختیار کیا۔ جو دوسرے اخباروں کا ہے۔ تو علیحدہ اخبار نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

سری بلاس۔ مجھ سے تو آپ لوگ کچھ پوچھتے ہی نہیں۔ میں بھی مدرسہ چھوڑ رہا ہوں۔ کل میرا نام بھی اخباروں میں نکلیگا۔

شیلو بلاس۔ تم میرے اخبار کے دفتر کے کلرک ہو جانا۔

سری بلاس۔ جی ہاں! سارے دن میز پر بیٹھے بیٹھے سر کھپاتے گا۔ میں نے تو کھیتی باڑی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ہل جوتوں گا۔ اور نئی نئی فصلیں پیدا کروں گا۔

شیو بلاس۔ ہاں اخبار کی پالیسی کے متعلق تم سے گفتگو کرنے کا مجھے اب تک موقعہ ہی نہیں ملا۔ میں سیاسیات کی الجھن میں نہ پڑکر تمدنی اصلاحوں پر اپنی ساری قوت صرف کرنا چاہتا ہوں۔ ہم اس وقت آنکھیں بند کئے ہوئے مغربی معاشرت کے پیچھے دوڑے جارہے ہیں۔ میں تکلف اور نمائش کی زندگی کے خلاف آواز بلند کردوں گا۔ "بیدار اور سادہ معاشرت" میرا اصول عملی ہوگا۔ مغرب کی تقلید دولت کو شرافت، انسانیت، اعزاز اور وقار کا پیمانہ بنادیا ہے۔ ہم اپنے اسلاف کی قناعت، اور اعتدال اور پاک نفسی کو بھول گئے ہیں۔ جہاں دیکھئے وہاں سرمایہ داروں کی، اہل دولت کی۔ زمینداروں کی نمود ہے۔ میں بیکسوں کی حمایت کو اپنا دستورالعمل قرار دوں گا۔ گو یہ خیالات نئے نہیں ہیں کبھی کبھی اخباروں میں ان مباحث پر مضامین نظر آجاتے ہیں لیکن ابھی تک ان کی وقعت عالمانہ استدلال سے زیادہ نہیں ہے اور وہ بھی یورپ کے بعض فلاسفروں کی تقلید ہے۔ مثلاً ایڈورڈ کارپنٹر۔ رسکن۔ ٹیل وغیرہ ان خیالات کے موید اپنے اصول وعمل میں ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ اور اس وجہ سے ان کی تلقین کا کسی پر اثر نہیں پڑتا۔ میری زندگی ان اصولوں کی زندہ مثال ہوگی میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ دولت کی یہ گرم بازاری دیکھ کر کبھی کبھی میں اپنے ملک کی حالت سے مایوس ہوجاتا ہوں۔ چھوٹے بڑے، امیر وغریب سب اس کے غلام بنے ہوتے ہیں۔ علم وکمال کی عزت ہی اُٹھ گئی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ بڑے بڑے تاجدار اہل کمال کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ ایک زمانہ یہ ہے۔ کہ مذہبی تحریکیں بھی اہل زر کی دست نگر رہتی ہیں۔ ہمارے سادھو مہاتما اپدیشک کبھی دیہاتوں میں بھول کر بھی نہیں جاتے وہ پُرتکلف پنڈالوں میں تقریریں کرتے ہیں۔ موٹروں پر ہوا کھاتے ہیں۔ اور اہل زر

کے مہمان ہوتے ہیں علما۔ و فضلا بھی اس معبود زریں کی پرستش میں سرگرم ہیں جنہیں بیدار اور سادہ معاشرت کا نمونہ بننا چاہیے تھا۔ وہ نفس کے غلام بنے ہوتے ہیں۔ ایثار دنیا سے معدوم ہو گیا۔

سنت بلاس۔ آپ کے خیالات تو بالکل بالشویسٹوں کے سے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے علما اور فضلا کی کیا قدر کی ہے؟

فیلو بلاس۔ خوب معلوم ہے۔ وہ علما اور فضلا اسی سلوک کے سزاوار تھے جس طرح اہل زمین اپنی جائداد کو، اہل تجارت اپنی مصنوعات کو تن پروری کا وسیلہ بناتے ہیں۔ اس طرح ہمارے علما بھی کمال اور روشنی کو دولت پر قربان کرتے ہیں۔ ان کے لیے تعلیم گاہوں میں بیش قرار مشاہرے رکھے جاتے ہیں ان کی قدر و منزلت کا یہی معیار ہو گا۔ کیا یہ حالت افسوسناک نہیں ہے؟

سنت بلاس۔ تو کیا آپ کا منشا ہے کہ ہم دو ہزار سال پیچھے کی نیم وحشیانہ طرز معاشرت اختیار کر لیں۔ اس ترقی کے دور میں اس سادہ معاشرت کو واپس لانے کا خیال مضحکہ خیز ہے۔

فیلو بلاس۔ تم مجھے خواہ مخواہ ایک طولانی مباحثہ میں کھینچے لئے جاتے ہو۔ تم اس زمانہ کو اس لئے ترقی کا دور کہتے ہو کہ اس میں طبعیات نے حیرت انگیز ایجادیں کی ہیں۔ انسانی معلومات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اور دولت کمانے کے لئے بے انتہا ذرائع نکل آئے ہیں۔ اور قدیم زمانہ کو نیم وحشیانہ اور وحشیانہ دور اس لئے کہتے ہو کہ اس وقت یہ ایجادیں۔ یہ علمی انکشافات، یہ وسائل تجارت اور حصول زر نہ تھے۔ کیا میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ انسان کی زندگی کا تمہارے خیال میں کیا منشا

ہے۔

سنت بلاس۔ انسان کی زندگی کا منشا ہے۔ زندہ رہنا۔ قدرت کے عطا کئے ہوئے وسائل سے فائدہ اٹھانا۔ قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں کو ڈھونڈنا، انسانی زندگی کو زیادہ کامل، زیادہ وسیع، زیادہ رفیع بنانا۔

شیو بلاس۔ میرا تم سے کلی اتفاق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ تم طبیعات اور نظریات کے قائل ہو۔ میں تزکیہ اور تہذیب نفس کا۔ تم مجاز کے پیرو ہو۔ میں حقیقت کا۔ یہ لو دادا خود ادھر آرہے ہیں!

۹

تینوں لڑکوں نے اُٹھ کر باپ کی تعظیم کی۔ اور سر جھکا کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ رائے صاحب نے متفکرانہ انداز سے شیو بلاس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ تمہارا کالج کب کھلیگا؟

شیو بلاس۔ کالج تو دوسری تاریخ کو کھل جائیگا۔ لیکن اب میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ استعفےٰ بھیجدیا۔

ہری بلاس۔ یہ تم نے کیا حماقت کی۔ کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیتے۔ کیا مجھے اتنا جاننے کا حق بھی نہیں ہے۔

شیو بلاس۔ اتنی خطا ضرور ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا کورس ختم ہو گیا ہے اب صرف امتحان دینا باقی ہے۔ اور چونکہ میں اس پیشہ کو معاش کا وسیلہ نہیں بنانا چاہتا اس لئے امتحان میں شریک ہونے کی کوئی ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

ہری بلاس۔ مگر کسبِ معاش کا مسئلہ تو حل کرنا ہی پڑیگا۔ اس کی کیا صورت

نکالی ہے۔

شیو بلاس۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں۔ کیونکہ میں اپنی ضرورتوں کو گھٹا کر بہت قلیل آمدنی میں گذر سکتا ہوں۔ کچھ باغبانی کا کام کرکے گذران کر لوں گا۔ باقی وقت خدمت میں صرف کرنے کا ارادہ کرتا ہوں۔ میرا قصد ایک اخبار نکالنے کا ہے۔

ہری بلاس۔ تمہارے خیال میں اخبار نکالنا آسان ہے؟ اول تو کافی سرمایہ چاہیے۔ پھر نامساعد ملکی حالات کا مقابلہ۔ ابھی تم نے مشکلات کا کافی اندازہ نہیں کیا ہے۔ سمجھتے ہو کہ یہ راستہ آسان ہے۔ مگر چند ہی قدم چل کر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہاں قدم قدم پر کانٹے ہیں۔ میں اتنا خود غرض اور دنیا پرور نہیں ہوں کہ تمہارے قومی جوش خدمت کو دبانا چاہتا ہوں۔ لیکن اتنا جتا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ خوب سوچ سمجھ کر اس میدان میں آنا۔ ورنہ چند قدم چل کر ہمت ہار دی تو اسمیں ہم سب کی رسوائی ہوگی۔ میں تم سے امداد کا طالب نہیں ہوں۔ اور نہ میرے لئے یہ کم فخر کی بات ہے کہ میرا لڑکا قوم کا سرفروش خادم بنے۔ صرف تمہیں مشکلات سے باخبر کر دینا چاہتا ہوں تم کب تک جاؤ گے سنتو؟

سنت بلاس۔ میرا کالج تو ۱۵ جنوری کو کھلیگا۔

ہری بلاس۔ تمہیں کتنے روپیوں کی ضرورت ہے؟

سنت۔ کم سے کم ڈھائی سو۔ کیونکہ اسی مہینہ میں چھ ماہ کی فیس بھی داخل کرنی ہوگی۔

ہری بلاس۔ (بغلیں جھانکتے ہوئے) اس سے کم میں کام نہیں چل سکتا؟ میں آجکل ذرا زیر بار ہو رہا ہوں۔

سنت۔ میری عادت سے آپ واقف ہیں میں خود ہی حتےّ الامکان کفایت سے رہتا ہوں۔ اس سے کم میں کچھ انتظام نہ کرسکوں گا فیس کے علاوہ ایک سوٹ بھی بنوانا ہے میرے پاس کوئی اچھا سوٹ نہیں ہے۔

ہری بلاس۔ بھئی اس وقت سوٹ کو ملتوی رکھو میں کوئی وسیلہ نکال لوں۔ تو اس کی فکر کرلینا۔ ہاں فیس اور بورڈنگ کا انتظام کئے دیتا ہوں۔ اس سے کہاں نجات۔ پڑھو تو دو۔ نہ پڑھو تو دو۔

سنت۔ میں آپ کے اوپر خواہ مخواہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر آپ انتظام نہیں کرسکتے۔ تو میں خود ہی کوئی فکر لوں گا۔ مگر اس تخمینہ میں میں نے کمی کی مطلق گنجائش نہیں رکھی ہے۔

ہری بلاس۔ یہ تمہاری بُری عادت ہے۔ کہ ذرا ذرا سی بات پر چڑھ جاتے ہو۔ میری حالت دیکھ رہے ہو۔ پھر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں۔ معلوم نہیں سارا فرنیچر نیلام کرکے بھی مطالبوں سے نجات ہوتی ہے یا نہیں۔

سنت۔ اگر آپ کا یہی منشا ہے۔ کہ میں بھی کالج سے نام خارج کرالوں۔ تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔

ہری بلاس۔ (جھنجلا کر) بہتر ہے۔ نام خارج کرالو۔ دیکھتا ہوں تم ضرورتوں کے غلام ہوتے جاتے ہو۔

آجکل ہندوستان ہی نہیں۔ یورپ میں بھی بیدار مغز طبقوں کا میلان سادہ اور بے تکلف معاشرت کی طرف ہو رہا ہے۔ اہلِ علم سے اب ایثار اور خدمت کی اُمید کی جاتی ہے۔ نہ کہ نمود اور جاہ طلبی کی سوسائٹی میں اب وکیلوں پر اعتقاد کی نگاہیں نہیں

پڑتیں۔ لوگ ان سے بدظن ہوتے جا رہے ہیں۔ اور فی الواقعہ یہ طبقہ اسی برتاؤ کا سزاوار ہے۔ میں نے بھی عام دستور کے موافق نہیں اس پیشہ کیلئے تیار کرنا نہیں چاہا تھا۔ لیکن اب مجھے اس کی بُرائیاں نظر آ رہی ہیں۔ اس پیشہ کی بدولت ہماری عدالتوں میں انصاف اتنا گراں ہو گیا ہے۔ کہ عوام کے لئے قریب قریب ناممکن الحصول ہے۔ جب ایک ایک پیشی کے دو دو چار چار سو۔ یہاں تک کہ ایک ایک ہزار روپے لئے جاتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ یہ محنت اور وقت کا معاوضہ نہیں۔ بلکہ محض لوگوں کے بغض اور حسد اور دُنیا طلبی کا تاوان ہے جس پیشہ کا مدار اور قیام محض انسانی خباثت اور کمزوریوں پر ہو۔ وہ بھی سوسائٹی کے لئے فلاح و برکت کا باعث نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ لیکن وکالت کے بجائے اگر تم کوئی زیادہ حلال صورت معاش نکالو تو مجھے زیادہ اطمینان ہوگا۔

سنت بلاس نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ ہو کر چلے گئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے سری بلاس سے پوچھا "تم امتحان کی تیاری کر رہے ہو نہ؟"

سری بلاس۔ جب آپ فرما رہے ہیں۔ کہ دولت مندوں کی آجکل کوئی قدر نہیں کرتا۔ تو پھر ایسی تعلیم سے کیا فائدہ جس کا منشا دولت پیدا کرنا ہے۔ میرا نام بھی مدرسہ سے خارج کروا دیجئے۔ میں آپ ہی کی خدمت سے فیض اٹھانا چاہتا ہوں میرا جی چاہتا ہے کھیتی کرنے کو۔ آخر آپ دیہات میں رہینگے تو کچھ نہ کچھ کھیتی باڑی ضرور ہی کرائینگے۔ یہ کام میرے سپرد کر دیجئے۔ میں نئے تجربوں اور اصولوں کے مطابق کھیتی کرونگا۔ بھینس پالوں گا۔ فرصت کے وقت اپنے گاؤں کے لڑکوں کو پڑھاونگا۔ اور آپ سے پڑھونگا۔

اسی اثنا میں سمترا آ گئی۔ ہری بلاس نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ہری بلاس نے تمہاری فکروں کا خاتمہ کر دیا تم سوچ رہی تھیں کہ کیسے کیا ہو گا۔ اب چل کر آرام سے گاؤں میں رہو۔ یہ کھیتی کریں گے۔ تم بکھاروں میں اناج بھرنا۔ اور رام کا نام لینا۔

۱۰

تیسرے دن بابو ہری بلاس اپنے موضع میں آ گئے۔ مکان بے مرمت پڑا ہوا تھا چاروں طرف گھاس جم گئی تھی۔ گاؤں والوں نے دروازے پر کھاد اور کوڑے کے ڈھیر لگا دیئے تھے۔ ادھر کتنی سال سے بابو صاحب گھر نہ آتے تھے۔ گھر میں قدم رکھتے۔ کراہیت سی ہوتی تھی۔ صاف بنگلوں میں رہنے کے عادی ہو گئے تھے۔ شیو بلاس نے اسباب اُتارے اور جھاڑو لے کر دروازہ کی صفائی کرنے لگے۔ انجنی جو ڈپٹی صاحب کی بڑی لڑکی تھی۔ اندر جھاڑو لگانے لگی۔ سری بلاس کچھ دیر تو کھڑا تاکتا رہا۔ تب ایک ٹوکری لے کر کوڑا پھینکنے لگا۔ سنت بلاس یہاں نہ آتے تھے۔ ماں سے ضد کر کے روپے اینٹھ لیتے تھے۔ اور الہ آباد کی راہ پکڑی تھی۔ گاؤں میں جونہی معلوم ہوا کہ ہری بلاس نے استعفا دے دیا ہے۔ لوگ اِدھر اُدھر مزاج پُرسی کو آنے لگے۔ ہری بلاس باہر ایک ٹوٹی کھاٹ پر غمزدہ بیٹھے سوچ رہے تھے۔ کہ موروثی جائداد کیونکر ہاتھ آتے۔ سمترا اندر کھڑی سوچ رہی تھی۔ کہ یہ کوڑے کرکٹ کا انبار کیونکر ٹلے گا۔ اس کے قبل یہ لوگ جب گھر آتے تھے۔ تو گاؤں والے ان پر حیرت آمیز رشک کرتے تھے اور ان کے ساز و سامان کو اس طرح دیکھتے تھے۔ گویا کسی عجائب خانہ کی سیر کر رہے ہوں۔ اُن غریبوں کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہ ان سے کچھ بولیں۔ مگر اب وہ سارے سامان غائب تھے نہ لڑکوں

ہیں وہ رعونت تھی۔ نہ ڈپٹی صاحب اور مسٹرایں وہ مربیانہ اندازِ گفتگو۔ لوگوں کو ان کے ساتھ ہمدردی سی ہوگئی۔ عورتیں انھی کے ساتھ گھر کی صفائی کرنے لگیں کئی مردوں نے نشیو بلاس کو جھاڑو اور ہری بلاس کو نوکری سے نجات دی۔ یہ دونوں پسینے میں شل ہو رہے تھے اور سوچ رہے تھے۔ کہ موٹا کام دُنیاءِ خیال میں چاہے کتنا ہی دلآویز نہ ہو۔ واقعات کی دنیا میں وہ اتنا پسندیدہ نہیں۔ رام بھروسے پنڈت نے بابو ہری بلاس سے کہا۔ بھیا۔ تم نے اچھا کیا۔ استیپھا دے دیا۔ دیس پردیس مارے مارے پھرتے تھے اب سُکھ سے گھر میں رہو گے۔ گھر مٹی میں ملا جاتا تھا۔ اب بس جائیگا۔

شیخ عید دبولے۔ چاکری چاہے چھوٹی ہو چاہے بڑی چاکری ہی ہے۔ جب اللہ نے سب کچھ تمہارے گھر میں دے دیا ہے تو کیوں کسی کی بندگی کرو۔

گوبر چوکیدار بولا۔ عُہدہ بابو بُہدا بڑا تھا۔

بھوجو کرمی نے کہا۔ عُہدا تو بڑا تھا۔ عُہدا کتنے غریبوں کا گلا رتنیا پڑتا تھا۔ سیکڑوں کو جیل بھیجا ہوگا۔ اس لڑائی میں پرجا کو مار مار کر سرکار کو کرج دلایا ہوگا۔ دورے پر جاتے ہوں گے تو بیگار لینا پڑتی ہوگی۔ ان کے ہاتھوں کتنے کسانوں کا اکھراج اور بیدخلی ہوئی ہوگی۔ گھر میں رہینگے تو اس جھنجٹ سے تو گلا چھوٹ جائیگا۔

گوبر چوکیدار۔ رواب کتنا تھا۔ حکومت کتنی تھی۔

بھوجو۔ رواب عُہدے سے نہیں ہوتا۔ رواب بھل منسی سے ہوتا ہے۔ بدیا اور دھرم سے ہوتا ہے۔ رام بھروسے پنڈت کون عُہدے والے ہیں لیکن کیوں سب لوگ گھاٹ سے اُٹھ کر پالاگن کرتے ہیں۔ تھانیدار آتے ہیں تو ان کی خاطر ایک چلم تماکھو دینا سب کو اکھرتا ہے لیکن ساستری مہاراج جس کے گھر اپنے دس

پانچ چیلوں سمیت آجاتے ہیں۔ وہ اپنے بھاگ کو سراہتا ہے۔ ضلا میں ایک سے ایک حاکم پڑے ہیں۔ مُدّا اساستری جی کی طرح کس کا رواب ہے؟ آج جو حکم دیویں تو لوگ آگ میں کُود پڑیں۔

رام بھروسے۔ بابو سنت بلاس نہیں دکھائی پڑتے۔

ہری بلاس۔ وہ وکالت پڑھنے چلے گئے۔

رام بھروسے۔ بھیا یہ بدیا تو تم انہیں ناحک پڑھاتے ہو۔ بڑے کو کرم کرنے پڑتے ہیں۔ وکیلوں کا مارا سارا جلا تو راہ ہو گیا۔ سب کو لڑا لڑا کے بھکاری کر دیا

عیدو۔ بھیاّ تم اپنی جمین چھڑالو۔ اور مجھ سے کھیتی کراؤ۔ چاکری بہت کی اب کچھ دن گرہستی کا مجا چکھو۔ یہاں اتنا چین تو نہ ملے گا لیکن چولا مست رہے گا۔ پردیس میں جو کچھ کماتے تھے۔ سب کا سب کپڑے لتے۔ کرسی۔ میج۔ میوہ مٹھائی۔ دودھ ملائی میں اُڑ جاتا ہوگا۔ بیس پچیس کا تو دودھ ہی پی جاتے ہوگے۔ اور نہیں تو پچاس روپیہ گھر کا کرایہ ہوگا۔ کھا پی کے سب برابر ہو جاتا ہوگا۔

ہری بلاس۔ زمین چھڑانے کے واسطے روپے کہاں سے لاؤں

سب آدمیوں نے ان کی طرف حیرت آمیز اشتباہ سے دیکھا۔ گویا وہ کوئی انوکھی بات کہہ رہے ہیں۔ آخر مصو جو بولا۔ کیا کہتے ہو بھیاّ۔ کون بہت روپے چاہئے ہونگے تین چار ہجار تو تمہارے بکس کے ایک کونے میں دھرے ہونگے۔ اتنی بڑی طلب پاتے تھے۔ نجر نجرانہ لیتے رہے ہونگے۔ یہ سب کہاں اڑا دیا۔

ہری بلاس۔ میں کسی سے نذر نذرانہ نہ لیتا تھا۔ تنخواہ میں گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ بچت کہاں سے ہوتی۔

بھوجو۔ ایسا کیا ہوگا۔ دس بیس ہزار تو بٹورا ہی ہوگا۔
ہری بلاس۔ نہیں چچا۔ سچ مانئے۔ میں بالکل خالی ہاتھ ہوں۔
بھوجو۔ تب گجر بسر کیسے ہوگا۔
ہری بلاس۔ پرماتما مالک ہیں۔ ابھی تو کچھ نظر نہیں آتا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ ٹھاکر کرن سنگھ جو اس نواح میں سب سے بڑے زمیندار تھے اپنے دو مصاحبوں کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ لوگ چارپائیوں سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہری بلاس جب تک برسر اقتدار تھے۔ ایسے کتنے ہی زمیندار روزانہ انہیں سلام کرنے کو حاضر ہوتے تھے۔ پر کرن سنگھ کو دیکھ کر وہ اضطراری طور پر تعظیماً اُٹھ بیٹھے۔ ہاتھی سامنے آکر رُکا۔ کرن سنگھ اُتر پڑے اور ہری بلاس کو چارپائی پر بٹھا کر خود بیٹھے ہوئے بولے۔ بابو صاحب۔ آپ کے مبارک قدموں سے آج یہ گاؤں پوتر ہوگیا۔ آج اخبار کھولا تو پہلے آپ ہی کی خبر نظر آئی۔ غرور سے متوالا ہوگیا۔ آپ کی ہمت اور ایثار کو آفرین ہے۔

ہری بلاس نے احسان مندانہ انکسار سے کہا۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے۔ کچھ دُبلے نظر آرہے ہیں۔

کرن سنگھ۔ اب آپ کی دیا سے بہت اچھی طرح ہوں۔ مہینوں سے بیمار تھا آج آپ کی خبر دیکھ کر خود بخود چنگا ہوگیا۔ پرماتما نے شاید ہماری کاربراری کے لئے آپ کے دل میں یہ تحریک کی ہم نے ادھر کچھ دنوں سے ایک پنچایت قائم رکھی ہے۔ پر اس کا کوئی سرپنچ ایسا نہ ملتا تھا جس پر خاص و عام کو بھروسہ ہو۔ آپ کو پرماتما نے اُس کا بیڑا پار کرنے کے لئے بھیجدیا۔ میں آج صبح ہی اُٹھ کر راجہ صاحب ملاؤں، ٹھاکر صاحب

بلما اور دونی چند ساہ کے پاس گیا تینوں اصحاب آپ کا نام سُن کر اچھل پڑے ان لوگوں کی طرف سے میں آپ سے یہ درخواست کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سرپنچی کا عہدہ قبول فرمائیں عین نوازش ہوگی۔

ہری بلاس ہیں آپکی خدمت کے لئے حاضر ہوں پر اپنے تئیں اس اعزاز کے قابل نہیں سمجھتا جس پنچایت کے ارکین ایسے ایسے صاحب ثروت لوگ ہوں اُسکے صدر بننے کی جرأت میں نہیں کر سکتا۔

کرن سنگھ۔ بابو صاحب یہ نہ کہئے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے اس جوار میں اِس وقت آپ کو لوگ کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیا چھوٹے کیا بڑے سب آپ کے معتقد ہوگئے ہیں۔ پہلے آپ پرگنہ کے حاکم تھے۔ اب آپ کی حکومت رعایا کے دلوں پر ہے۔ میری یہ ناچیز استدعا قبول کیجئے۔

ہری بلاس اعزاز کے بارے سر نہ اُٹھا سکے اُن کی خموشی رضامندی کی معترف تھی۔ کرن سنگھ اُٹھے اور پھولوں کا ہار اپنے ایک مصاحب سے لیکر ان کی گردن میں ڈال دیا۔ اور تب ایک لمحہ تک کسی تشویش انگیز خیال میں غرق رہنے کے بعد شرماتے ہوتے بولے۔ بابو جی آپ نے میری ایک عرض تو قبول کرلی۔ اب مجھے دوسری درخواست کرنے کی جرأت ہو رہی ہے۔ اجازت ہے۔ عرض کروں۔

ہری بلاس۔ شوق سے فرمایئے۔ میں آپ کی خدمت کے لئے دل و جان سے حاضر ہوں۔

کرن سنگھ نے جیب سے ایک لفافہ سر بمہر نکالا اور بولے میں اسے آپکے قدموں پر نثار کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

ہری بلاس نے دبی ہوئی متجسّس نگاہوں سے لفافہ کی طرف دیکھا لکھا ہؤا تھا

"بیع نامہ ورہن نامہ رام بلاس کورمی۔ موضع بدوکھر"

احسان کے آنسوؤں سے اُن کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ شکریہ اور احسان مندی کا اظہار کرنے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے لیکن کرن سنگھ نے انہیں بولنے کا موقع نہ دیا۔ اِسی وقت اِس لفافے کے پُرزے کر دیئے۔

ہری بلاس نے لوگوں کیطرف دیکھ کر کہا۔ آپ کو یہ معلوم ہؤا یہ کیسے کاغذ تھے۔ یہ دادا کے لکھے ہوئے بیع نامہ اور رہن نامہ تھے۔ یہ کہتے کہتے رقت سے ان کی زبان بند ہوگئی ؎

ستی

دو صدیوں سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے مگر جنیتا دیوی کا نام برابر قائم ہے بندیلکھنڈ کے ایک اوجاڑ مقام پر آج بھی منگل کے روز ہزاروں عورت مرد جینتا دیوی کی پرستش کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ اس دن یہ اجاڑ فضا سہانے نغموں سے گونج اٹھتی ہے۔ وہاں کے ٹیلے اور ٹھیکرے عورتوں کے رنگ رنگ والی پوشاکوں سے سج جاتے ہیں دیوی کا مندر ایک بہت اونچے ٹیلے پر بنا ہوا ہے۔ اس کے کلس پر لہراتی ہوئی سرخ جھنڈی بہت دور سے نظر آتی ہے۔ مندر اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں دو آدمی ایک ساتھ مشکل سے سما سکتے ہیں۔ اس کے اندر کوئی مورت نہیں ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی بیدی بنی ہوئی ہے۔ نیچے سے مندر تک ایک سنگین زینہ ہے جس کے دونوں طرف دیوار بنی ہوئی ہے۔ کہ بھیڑ میں دھکے سے کوئی نیچے نہ گر پڑے۔ یہیں جینتا دیوی ستی ہوئی تھی۔ مگر دستورِ زمانہ کے مطابق وہ اپنے مردہ شوہر کے ساتھ چتا پر نہیں بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر دست بستہ سامنے کھڑا تھا۔ مگر وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی۔ وہ شوہر کے جسم کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی روح کے ساتھ ستی ہوئی تھی۔ اس چتا پر شوہر کا جسم نہ تھا۔ اس کی آبرو جل کر خاک سیاہ ہو رہی تھی۔

۲

جمنا کے کنارہ پر کالپی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ چنتا اسی مقام کے ایک بہادر بندیلے کی لڑکی تھی۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مرچکی تھی۔ اس کی پرورش و پرداشت کا بار اسکے باپ پر پڑا تھا۔ وہ لڑائیوں کا زمانہ تھا۔ سپاہیوں کو کمر کھولنے کی بھی فرصت نہ تھی وہ گھوڑے کی پشت پر کھانا کھاتے اور وہیں زین پر جھپکیاں لے لیتے تھے۔ چنتا کا بچپن باپ کے ساتھ میدانِ جنگ میں گذرا اسکا باپ اُسے کسی غار میں یا کسی درخت کی آڑ میں چھپا کر میدان میں چلا جاتا چنتا بلا کسی خوف کے اطمینان سے بیٹھی ہوئی مٹی کے قلعے بناتی اور بگاڑتی۔ اس کے گھروندے قلعے ہوتے تھے اُس کی گڑیاں اوڑھنی اوڑھتی تھیں وہ سپاہیوں کے گڈے بناتی اور انہیں لڑائی کے میدان میں کھڑا کرتی تھی کبھی کبھی اس کا باپ شام کو بھی واپس نہ آتا۔ مگر چنتا کو خوف چھو تک نہ گیا تھا۔ ویران جنگلوں میں بھوکی پیاسی رات رات بھر بیٹھی رہ جاتی۔ اس نے نیولے اور گیدڑ کی کہانیاں کبھی نہ سُنی تھیں۔ بہادروں کی جاں بازی کے افسانے سپاہیوں کی زبان سے سُن سُنکر وہ معیارِ ہمت بن گئی تھی۔

ایک مرتبہ تین روز تک چنتا کو اپنے باپ کی کچھ خبر نہ ملی۔ وہ ایک پہاڑ کی غار میں بیٹھی ہوئی دل ہی دل میں ایک ایسا قلعہ تیار کر رہی تھی جسکو دشمن کسی طرح بھی فتح نہ کرسکے تمام دن وہ اسی قلعہ کا نقشہ سوچتی اور تمام رات اسی قلعہ کا خواب دیکھتی۔ تیسرے روز شام کو اسکے باپ کے کئی ساتھیوں نے آکر اُس کے پاس رونا شروع کیا چنتا نے متعجب ہو کر پوچھا۔ داداجی کہاں ہیں؟ تم لوگ کیوں روتے ہو؟

کسی نے اس بات کا جواب نہ دیا۔ وہ زور سے ڈھاڑیں مار مار کر رونے لگے

چنتا سمجھ گئی کہ اس کا باپ میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اُس تیرہ سال والی لڑکی کے آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ چہرہ ذرا بھی اُداس نہ ہُوا۔ ایک آہ بھی نہ نکلی ہنسکر بولی اگر وہ لڑائی میں کام آئے تو تم لوگ روتے کیوں ہو؟ سپاہیوں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کونسی موت ہو سکتی ہے۔ اس سے بڑھکر ان کی بہادری کا اور کونسا صلہ مل سکتا ہے۔! یہ رونے کا نہیں۔ بلکہ خوشی منانے کا موقع ہے۔

ایک سپاہی نے متفکرانہ لہجہ میں کہا۔ ہمیں تمہاری فکر ہے۔ تم اب کہاں رہوگی؟

چنتا۔ اس کی تم کچھ فکر نہ کرو، دادا میں اپنے باپ کی بیٹی ہوں۔ جو کچھ انہوں نے کیا۔ وہی میں بھی کرونگی۔ اپنے وطن کی سرزمین کو دشمنوں کے پنجہ میں چھڑانے میں انہوں نے اپنی جان دیدی۔ میرے سامنے بھی وہی معیاد ہے۔ جا کر اپنے آدمیوں کو سنبھالئے۔ میرے لئے ایک گھوڑے اور تیز ہتھیاروں کا بندوبست کر دیجئے۔ ایشور نے چاہا تو آپ لوگ مجھ کو کسی سے پیچھے نہ پاویں گے لیکن اگر مجھے قدم پیچھے ہٹاتے دیکھنا۔ تو تلوار کے ایک وار سے میری زندگی کا خاتمہ کر دینا یہی آپ سے میری التجا ہے۔ جائیے اب دیر نہ کیجئے۔

سپاہیوں کو چنتا کے یہ بہادرانہ الفاظ سُن کر کچھ بھی تعجب نہیں ہُوا۔ ہاں انہیں یہ اندیشہ ضرور ہوا کہ کیا یہ نازک اندام لڑکی اپنے اس ارادہ پر قائم رہ سکے گی۔

۲

پانچ سال گذر گئے۔ سارے صوبہ میں چنتا دیوی کی دھاک بیٹھ گئی۔ دشمنوں کے پیر اکھڑ گئے۔ وہ فتح کا زندہ مجسمہ تھی۔ اُسے تیروں اور تفنگوں کے سامنے بےخوف کھڑے دیکھکر سپاہیوں کی حوصلہ افزائی ہوتی رہی اس کی موجودگی میں وہ کیسے قدم پیچھے ہٹاتے؟ جب نازک اندام عورت آگے بڑھے تو کون مرد قدم پیچھے ہٹا دیگا حُسن کی دیویوں کے

سامنے سپاہیوں کی شجاعت ناقابل فتح ہو جاتی ہے۔عورت کے لفظی تیر بہادروں کیلئے جانبازی کے خفیہ پیغام ہیں اُسکی ایک چتون بزدلوں میں بھی مردانگی پیدا کر دیتی ہے۔

چنتا کی خوبصورتی اور شہرت نے منچلے سورماؤں کو چاروں جانب سے کھینچ کھینچکر اس کی فوج کو سجا دیا۔جان پر کھیلنے والے بھونرے ہر سمت سے آ آکر اس پھول پر منڈلانے لگے۔انہیں بہادروں میں رتن سنگھ نامی ایک نوجوان راجپوت بھی تھا۔

یوں تو چنتا کے سپاہیوں میں سبھی تلوار کے دھنی تھے۔بات پر جان دینے والے اسکے اشارہ پر آگ میں کودنے والے اسکا حکم پاکر آسمان کے تارے توڑ لانے پر بھی آمادہ ہوجاتے لیکن رتن سب سے بڑھا ہوا تھا۔چنتا بھی اس کو دل سے چاہتی تھی۔رتن سنگھ دوسرے سپاہیوں کیطرح اکھڑ، منہ پھٹ یا گھمنڈی نہ تھا۔اور لوگ اپنی اپنی جوانمردی کا خوب بڑھا بڑھا کر بکھان کرتے۔خودستائی کرتے ہوئے انکی زبان نہ رُکتی تھی۔وہ کچھ کرتے، چنتا کو دکھانے کیلئے۔انکا مقصد اور ہے، ان کا فرض نہ تھا۔بلکہ چنتا تھی رتن سنگھ جو کچھ کرتا خاموش طریقہ پر۔اپنی تعریف کرنی تو در کنار، وہ خواہ کسی شیر کو ہی مار کر کیوں نہ آوے۔اسکا تذکرہ تک نہ کرتا تھا۔اسکی عاجزی اور انکساری تامل کی حد سے بھی متجاوز کر گئی تھی۔دوسروں کی محبت میں عیش پسندی تھی۔مگر رتن سنگھ کی محبت میں غنا اور ایثار اور لوگ میٹھی نیند سوتے تھے مگر رتن سنگھ تارے گن گن کر رات کاٹتا تھا۔اور سبھی اپنے اپنے دلوں میں سمجھتے تھے کہ چنتا میری ہوگی۔صرف رتن سنگھ نا امید تھا۔اور اسلئے اس کو نہ کسی سے رغبت تھی نہ نفرت دوسروں کو چنتا کے سامنے چہکتے دیکھ کر اُسے ان کی گویائی پر تعجب ہوتا۔ہر لمحہ اس کی یاس انگیز تاریکی اور بھی زیادہ گہری ہوتی جاتی تھی۔کبھی کبھی وہ اپنی بیوقوفی پر جھنجلا اٹھتا۔کیوں ایشور نے اسے ان اوصاف سے بے بہرہ رکھا۔

جو عورتوں کے دل کو فریفتہ کرتے ہیں۔ اُسے کون پوچھے گا؟ اس کے دردِ دل سے کون واقف ہے؟ مگر وہ دل ہی میں جھنجلا کر رہ جاتا تھا۔ اس میں دکھاوے کی سکت ہی نہ تھی۔

نصف سے زیادہ رات جا چکی تھی۔ چنتا اپنے خیمہ میں آرام کر رہی تھی۔ سپاہی بھی سخت منزل طے کرنے کے بعد کچھ کھا پی کر غافل پڑے ہوئے تھے۔ آگے ایک گھنا جنگل تھا جنگل کے دوسری طرف دشمنوں کا ایک دستہ پڑاؤ ڈالے پڑا، چنتا اس کی آمد کی خبر پا کر رواں رواں چلی آ رہی تھی۔ اُس نے علے الصباح دشمنوں پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ دشمنوں کو میرے آنے کی خبر نہ ہوگی لیکن یہ اس کا محض خیال تھا۔ اس کی فوج کا ایک آدمی دشمنوں سے ملا ہُوا تھا۔ یہاں کی خبریں وہاں روزانہ پہونچتی رہتی تھیں۔ انہوں نے چنتا سے نجات پانے کے لئے ایک سازش کر رکھی تھی۔ اس کو چپ چاپ قتل کر دینے کے لئے تین شخصوں کو مقرر کر دیا تھا۔ ہر سہ اشخاص درندوں کی طرح دبے پاؤں جنگل کو پار کر کے آئے۔ اور درختوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر سوچنے لگے۔ کہ چنتا کا خیمہ کونسا ہے؟ کُل فوج بے خبر سو رہی تھی۔ اس سے اُنہیں اپنی کامیابی کا ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ وہ درختوں کی آڑ سے نکلے۔ اور زمین پر مگر کیطرح رینگتے ہوئے چنتا کے خیمہ کی طرف چلے۔

ساری فوج بے خبر سوتی تھی، پہرہ والے سپاہی بھی تھک کر چور ہو جانے کے سبب نیند میں غافل پڑے تھے۔ صرف ایک شخص چنتا کے خیمہ کے پیچھے سردی کی وجہ سے سُکڑا ہُوا بیٹھا تھا۔ یہ رتن سنگھ تھا۔ آج اُس نے یہ کوئی نئی بات نہیں کی تھی۔ پڑاؤں میں اس کی راتیں اسی طرح چنتا کے خیمہ کے پیچھے بیٹھے بیٹھے بسر ہوتی تھیں۔ حملہ آوروں کی آہٹ پا کر اس نے تلوار نکال لی اور چونک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ دیکھا کہ تین

آدمی جھکے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ لوگ ایکدوسرے پر وار کرکے آپس میں کٹ مریں۔ ادھر تنہا تین جوانوں سے مقابلہ کرنے میں جان کا اندیشہ۔ زیادہ سوچنے کا موقع نہ تھا۔ اس میں بہادروں کے فوری ارادہ کرنے کی قوت تھی۔ اس نے فوراً تلوار کھینچ لی۔ اور اُن پر یکبارگی ٹوٹ پڑا۔ کئی منٹ تک تلواریں تیزی سے چلتی رہیں۔ پھر سناٹا ہوگیا۔ اُدھر وہ تینوں زخمی ہوکر گر پڑے۔ اِدھر یہ بھی زخموں سے چور ہوکر بیہوش ہوگیا۔

علے الصباح چنتا اُٹھی تو چاروں جوانوں کو زمین پر پڑا دیکھا۔ اس کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ قریب جاکر دیکھا تو حملہ آوروں کی جان نکل چکی تھی۔ مگر رتن سنگھ کی سانس چل رہی تھی سارا واقعہ معاً سمجھ میں آگیا۔ نسائیت نے مردانگی پر فتح پائی۔ جن آنکھوں سے باپ کی موت پر آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ گرا تھا۔ اُنہیں آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے رتن سنگھ کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا اور اپنے دل کے صحن میں رچے ہوئے سوئمبر میں اس کے گلے میں جے مالا ڈالدی۔

۴

ایک مہینہ تک نہ رتن سنگھ کی آنکھیں کھلیں اور نہ چنتا کی آنکھیں بند ہوئیں چنتا اُس کے پاس سے ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوتی۔ اُسے نہ اپنے علاقہ کی پرواہ تھی۔ نہ دشمنوں کے بڑھتے چلے آنے کی فکر۔ وہ رتن سنگھ پر اپنے لوازمات کو نچھاور کرچکی تھی پورا مہینہ گذر جانے کے بعد رتن سنگھ کی آنکھ کھلی۔ دیکھا تو خود چارپائی پر پڑا ہوا ہے اور چنتا سامنے پنکھا لئے کھڑی ہے۔ کمزور لہجہ میں بولا۔ چنتا! پنکھا مجھے دے دو تمہیں تکلیف ہورہی ہے۔

چنتا کا دل مسرت سے نغمہ ریز ہوگیا۔ ایک ماہ قبل جس خستہ و نحیف شخص کے

سرہانے بیٹھ کر وہ مایوسی سے رویا کرتی تھی۔ آج اُسے بولتے دیکھ کر اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔ اُس نے محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ سوامی اگر یہ تکلیف ہے۔ تو آرام کیا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ اس سوامی کے لفظ میں عجیب منتر کی سی تاثیر تھی۔ رتن سنگھ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ بجھا ہُوا چہرہ روشن ہو گیا۔ رگوں میں ایک نئی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی۔ اور وہ زندگی کتنی جذبہ خیز تھی۔ اُس میں کتنا حوصلہ۔ کتنی حلاوت، کتنی مسرت، کتنی رقت تھی۔ رتن سنگھ کا ہر عضو پھڑک اُٹھا۔ اسے اپنے بازوؤں میں غیر معمولی قوت کا احساس ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہُوا کہ گویا وہ کل دُنیا کو فتح کر سکتا ہے اُڑ کر آسمان پر پہنچ سکتا ہے۔ پہاڑوں کو پھاڑ سکتا ہے ایک لمحہ کے لئے اُسے ایسی آسودگی ہوئی۔ گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہو گئیں ہیں۔ گویا وہ اب کسی سے کچھ نہیں چاہتا تھا۔ شاید مہادیو جی کو بھی سامنے کھڑے ہوئے دیکھ کر منہ پھیر لیگا۔ کوئی بردان نہ مانگے گا۔ اُسے اب کسی چیز کی بھی خواہش نہ تھی۔ اُسے ایسا غرور ہو رہا تھا۔ گویا اس سے زیادہ فارغ البال اس سے زیادہ خوش نصیب شخص دنیا میں اور کوئی نہ ہوگا۔

چنتا ابھی اپنی بات پوری نہ کرنے پائی تھی۔ اُسی سلسلہ میں بولی۔ ہاں آپ کو میرے سبب البتہ ناقابل برداشت تکلیف اٹھانی پڑی۔

رتن سنگھ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بلا تپسیا کے پھل نہیں ملتا۔

چنتا نے رتن سنگھ کو نازک ہاتھوں سے لٹاتے ہوئے کہا۔ اس پھل کے لئے تم نے تپسیا نہیں کی تھی۔ جھوٹھ کیوں بولتے ہو؟ تم صرف ایک کمزور عورت کی حفاظت کر رہے تھے۔ اگر میرے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی تو بھی تم اپنی ہی تن دہی سے اُس کی حفاظت کرتے۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں۔ کہ میں نے تمام عمر

کے لئے۔ برہمچریہ (تجرد) کا عہدہ کر لیا تھا۔ مگر تمہاری جان نثاری نے میرے اُس عہد کو شکست ڈالا۔ میری پرورش بہادروں کے گود میں ہوئی ہے۔ میرا دل اُسی شیر دل شخص کے قدموں پر نچھاور ہو سکتا ہے۔ جو جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ شوقینوں کی اٹکھیلیوں اور اوباشوں کی نظر بازیوں اور چالاکوں کو چالاکیوں کی میرے دل میں ذرا بھی وقعت نہیں۔ ان کی ظاہرداریوں کو میں صرف تماشے کی طرح دیکھتی ہوں۔ تمہارے دل میں ہی میں نے سچا ایثار پایا۔ اور تمہاری کنیز ہو گئی آج سے نہیں بلکہ بہت دنوں سے۔

۵

وصال کی شب اولیں تھی۔ چاروں طرف سناٹا۔ صرف محبت بھرے دلوں میں تمناؤں کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ چاروں طرف عشق افروز چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کے تبسم آگیں منظر میں دولہا دلھن باہم اظہار عشق کر رہے تھے۔

دفعتاً خبر ملی کہ دشمنوں کی فوج قلعہ کی طرف بڑھی چلی آتی ہے چنتا چونک پڑی۔ رتن سنگھ کھڑا ہو گیا۔ اور اس نے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی تلوار اُتار لی۔

چنتا نے اس کی طرف بزدلانہ محبت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔ کچھ آدمیوں کو اُدھر بھیج دو۔ تمہارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔

رتن سنگھ نے بندوق کو کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ مجھے خوف ہے کہ اب کے وہ لوگ بہت بڑی تعداد میں آ رہے ہیں۔

چنتا۔ تو میں بھی چلوں گی۔

رتن۔ نہیں، مجھے اُمید ہے کہ وہ لوگ ٹھہر نہ سکیں گے۔ میں ایک ہی حملہ میں اُن کے قدم اُکھاڑ دوں گا۔ یہ ایشور کی مرضی ہے کہ ہماری سہاگ رات فتح کی رات ہو۔

چنتا۔ نہ جانے میرا دل کیوں ڈر رہا ہے، جانے دینے کو جی نہیں چاہتا۔

رتن سنگھ نے اس سادہ اور محبت آمیز گفتار سے بیقرار ہوکر چنتا کو گلے سے لگالیا اور کہا میں صبح تک واپس آجاؤں گا، پیاری!

چنتا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈال کر باچشم نم بولی مجھے اندیشہ ہے کہ تم بہت دنوں میں واپس آؤ گے۔ میرا دل تمہارے ساتھ رہیگا۔ جاؤ۔ مگر روزانہ خبر بھیجتے رہنا۔ تمہارے پیروں پڑتی ہوں، موقع و محل کا خیال کرکے حملہ کرنا۔ تمہاری عادت ہے کہ دشمن کو دیکھتے ہی بیقرار ہو جاتے ہو۔ اور جان پر کھیل کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہو۔ تم سے میری یہی التجا ہے کہ موقع دیکھ کر کام کرنا۔ جاؤ جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو۔ اسی طرح منہ دکھاؤ۔

چنتا کا دل افسردہ ہوگیا۔ اس میں پہلے صرف فتح کی تمنا تھی۔ اب عافیت تمنا اس پر غالب تھی۔ وہی بہادر لڑکی جو شیرنی کیطرح گرج کر دشمنوں کے کلیجے ہلا دیتی تھی آج اتنی کمزور ہو رہی تھی کہ جب رتن سنگھ گھوڑے پر سوار ہوا تو خود دل ہی دل میں دیوی سے اس کی جان کی خیر منا رہی تھی۔ جب تک وہ درختوں کی آڑ میں چھپ نہ گیا۔ دھکڑی اُسے دیکھتی رہی۔ پھر وہ قلعہ کے سب سے اونچے برج پر چڑھ گئی۔ اور گھنٹوں اسی طرف تاکتی رہی۔ وہاں سونا تھا۔ پہاڑیوں نے رتن سنگھ کو پہلے ہی اپنی گود میں چھپا لیا تھا۔ مگر چنتا کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سامنے چلے جا رہے ہیں۔ جب صبح کا سرخ منظر درختوں کے درمیان سے نظر آنے لگا تو اس کی محویت دور ہوتی معلوم ہوا۔ چاروں طرف سونا ہے۔ وہ روتی ہوئی برج سے اُتری اور پلنگ پر منہ ڈھانک کر رونے لگی۔

۶

رتن سنگھ کے ساتھ مشکل سے سو آدمی تھے۔ مگر سبھی مشاق۔ موقع اور تعداد کو خیال میں نہ لانے والے اور خود اپنی جان کے دشمن۔ جو بہادرانہ جوش سے بھرے ہوئے اور اسی قسم کا ایک متحرک گیت گاتے ہوئے گھوڑوں کو بڑھاتے چلے جاتے تھے۔

بانکی تیری پاگ سپاہی، اس کی رکھنا لاج

تیغ تبر کچھ کام نہ آوے   بکتر ڈھال یونہی رہ جاوے

رکھیو من میں لاگ

سپاہی بانکی تیری پاگ، اس کی رکھنا لاج

پہاڑیاں ان جنگی نغموں سے گونج رہی تھیں۔ گھوڑوں کے سموں کی آواز تال کا کام دے رہی تھیں حتیٰ کہ رات گذر گئی۔ آفتاب نے اپنی سرخ آنکھیں کھولدیں۔ اور ان جانبازوں پر زر افشانی کرنے لگا۔

وہیں خونیں اجالے میں دشمنوں کی فوج ایک پہاڑی پر خیمے ڈالے ہوئے نظر آئی۔

رتن سنگھ سر جھکائے اور فرقت زدہ دل کو تھامے ہوئے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا۔ قدم آگے پڑتا تھا۔ مگر دل پیچھے ہٹتا تھا۔ آج زندگی میں اول مرتبہ خیالاتِ پریشان نے اُسے مشوش بنا رکھا تھا۔ کون جانتا تھا کہ جنگ کا انجام کیا ہوگا۔ جس بہشت کی راحت کو چھوڑ کر آیا تھا۔ اسکی یاد رہ رہ کر دل کو مسوس رہی تھی۔ چنتا کی آنسو بھری آنکھیں یاد آتی تھیں۔ جی چاہتا تھا۔ کہ گھوڑے کی باگ موڑ دے۔ ہر لمحہ جنگ کا حوصلہ کم ہوتا جاتا تھا۔ دفعتاً ایک سردار نے قریب آکر کہا۔ بھیا وہ دیکھو اونچی پہاڑی پر دشمن ڈیرے ڈالے پڑا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ ہم تو چاہتے ہیں۔ کہ فوراً ان پر حملہ کر دیں۔ غافل

پڑے ہوئے ہیں بھاگ کھڑے ہونگے۔ دیر کرنے سے وہ بھی سنبھل جائینگے۔ اور تب معاملہ نازک ہو جاویگا۔ ایک ہزار سے کم نہ ہونگے۔

رتن سنگھ نے متفکرانہ نگاہوں سے دشمن کی طرف دیکھکر کہا۔ ہاں معلوم تو ہوتا ہے

سردار۔ تو پھر دھاوا بول دیا جائے نا؟

رتن۔ جیسی تمہاری مرضی ہو۔ تعداد زیادہ ہے، یہ سوچ لو۔

سردار۔ اسکی پرواہ نہیں ہم اس سے بڑی فوجوں کو شکست دے چکے ہیں۔

رتن۔ یہ سچ ہے۔ مگر آگ میں کودنا مصلحت نہیں۔

سردار۔ بھیا۔ تم کہتے ہو، سپاہی کی تو زندگی ہی آگ میں کودنے کیلئے ہے تمہارے حکم کی دیر ہے۔ پھر ہمارا جیوٹ دیکھنا۔

رتن۔ ابھی ہم لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ ذرا آرام کر لینا بہتر ہے۔

سردار۔ نہیں بھیا۔ ان سبھوں کو ہماری آہٹ مل گئی۔ تو غضب ہو جائیگا۔

رتن۔ تو پھر دھاوا بول ہی دو۔

ایک لمحہ میں بہادروں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھاویں اور نیزے سنبھالے ہوئے دشمن کی فوج پر حملہ آور ہوئے۔ مگر پہاڑی پر جاتے ہی ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ دشمن غافل نہیں ہے۔ ان لوگوں نے ان کے بارے میں جو قیاس کیا تھا۔ وہ غلط تھا۔ وہ کافی ہوشیار ہی نہ تھے۔ بلکہ خود قلعہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے جب انہیں سامنے آتے دیکھا۔ تو سمجھ گئے کہ غلطی ہوئی۔ لیکن اب مقابلہ کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ پھر بھی وہ مایوس نہ تھے۔ رتن سنگھ جیسے باکمال افسر کے ساتھ انہیں کبھی غم کا اندیشہ نہ تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ مشکل موافعہ پر اپنے جنگی کمال کی بدولت

فتحیاب ہو چکا تھا۔ کیا آج وہ اپنا کمال نہ دکھائیگا۔ ساری آنکھیں رتن سنگھ کو کھوج رہی تھیں مگر اسکا وہاں کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ کہاں چلا گیا۔ یہ کوئی نہ جانتا تھا۔

مگر وہ کہیں نہیں جا سکتا، وہ اپنے ساتھیوں کی ایسی نازک حالت میں چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ ایسا تو ناممکن نہیں۔ وہ ضرور یہیں ہے اور ہاری ہوئی بازی کے جیتنے کی کوئی تدبیر سوچ رہا ہے۔

ایک لمحہ میں دشمن انکے مقابل آ پہونچے۔ اتنی کثیر التعداد افواج کے آگے یہ مٹھی بھر آدمی کیا کر سکتے تھے۔ چاروں طرف سے رتن سنگھ کی پکار ہونے لگی بھیا، تم کہاں ہو؟ ہمیں کیا حکم دیتے ہو۔ دیکھتے ہو وہ لوگ سامنے آ پہونچے مگر تم ابھی تک خاموش کھڑے ہو۔ سامنے آ کر ہمیں راستہ دکھلاؤ۔ ہمارا حوصلہ بڑھاؤ

مگر اب بھی رتن سنگھ نہ دکھائی دیا۔ یہاں تک کہ دشمن کی فوج سر پر آ پہونچی اور دونوں فوجوں میں تلواریں چلنے لگیں۔ بندیلوں نے سر بکف ہو کر لڑنا شروع کیا۔ مگر ایک کو ایک بہت ہوتا ہے۔ ایک اور دس کا مقابلہ کیا۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ جان کی بازی تھی۔ بندیلوں میں یاس کی غیر معمولی طاقت تھی۔ خوب لڑے۔ مگر کیا مجال کہ قدم پیچھے ہٹے۔ ان میں اب ذرا بھی جماعت بندی نہ تھی جس سے جس قدر آگے بڑھتے بنا۔ بڑھا۔ انجام کیا ہوگا۔ اس کی کسی کو فکر نہ تھی۔ کوئی تو دشمنوں کی صفیں چیرتا ہوا افسر کے قریب پہونچ گیا۔ کوئی اس کے ہاتھی پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہوا مارا گیا۔ ان کی غیر معمولی ہمت دیکھ کر دشمنوں کے منہ سے بھی صدائے آفرین نکلتی تھی۔ لیکن ایسے جانبازوں نے نام پایا ہے۔ فتح نہیں پائی۔ ایک گھنٹہ میں اسٹیج کا پردہ گر گیا۔ تماشہ ختم ہو گیا ایک آندھی تھی جو آئی اور درختوں کو اکھاڑتی ہوئی چلی گئی۔ متحد رہ کر یہی مٹھی بھر آدمی دشمنوں

کے دانت کھٹے کر سکتے تھے۔ مگر جس پر جماعت بندی کا بار تھا۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ فتح مند مرہٹوں نے ایک ایک نعش کو غور سے دیکھا۔ رتن سنگھ ان کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا اُسی پر ان کے دانت لگے تھے۔ رتن سنگھ کے جیتے جی انہیں نیند حرام تھی۔ لوگوں نے پہاڑی کی ایک ایک چٹان دیکھ ڈالی۔ مگر رتن سنگھ ہاتھ نہ آیا۔ جیت ہوئی پر ادھوری۔

۷

چنتا کے دل میں آج نہ جانے کیوں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے وہ کبھی اتنی کمزور نہ تھی۔ بندیلوں کی ہار ہی کیوں ہوگی۔ اس کا کوئی سبب تو وہ نہ بتا سکتی تھی۔ مگر یہ خیال اُس کے دل سے کسی طرح دور نہ ہوتا تھا۔ اُس بدنصیب کی قسمت میں محبت کا سُکھ بھوگنا بدا ہوتا تو کیا بچپن ہی میں ماں مرجاتی۔ باپ کے ساتھ جنگل جنگل گھومنا پڑتا۔ گڈھوں اور غاروں میں رہنا پڑتا؟ اور وہ سہارا بھی تو بہت دن نہ رہا۔ باپ بھی منہ موڑ کر چل دیئے۔ جب سے اس کو ایک روز بھی تو چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بدقسمتی کیا اب اپنا مکروہ تماشہ چھوڑ دیگی؟ آہ اس کے کمزور دل میں اس وقت ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ ایشور اس کے پیارے شوہر کو آج بخیریت واپس لاوے تو اُسے لیکر کسی دور کے گاؤں میں جا بسے گی۔ اور اپنے شوہر کی خدمت اور پرستش میں اپنی زندگی وقف کر دیگی۔ اس لڑائی سے ہمیشہ کے لئے منہ موڑ لے گی۔ آج اول مرتبہ نسائیت کا جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوا

شام ہوگئی تھی۔ آفتاب کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سر جھکائے کوئی چھپنے کی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ دفعتاً ایک سپاہی برہنہ سر۔ برہنہ پا۔ بلا کسی ہتھیار کے اُسکے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ چنتا پر گویا بجلی گری۔ ایک لمحہ تک وہ مبہوت سی بیٹھی رہی۔

پھر اُٹھ کر گھبرائی ہوئی سپاہی کے پاس گئی۔ اور مضطربانہ لہجہ میں پوچھا۔ کون کون بچا؟

سپاہی نے کہا۔ کوئی نہیں۔

"کوئی نہیں! کوئی نہیں" چنتا سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

سپاہی نے پھر کہا۔ مرہٹے قریب آپہونچے۔

"قریب آپہونچے"؟

"بہت قریب"۔

"تو فوراً چتا تیار کراؤ" "وقت نہیں ہے"۔

"ابھی ہم لوگ تو سرفروشی کے لئے حاضر ہیں"۔

"تمہاری جو مرضی، میرے فرض کا تو یہیں خاتمہ ہے"۔

"قلعہ بند کر کے ہم مہینوں لڑ سکتے ہیں"۔

"تو جا کر لڑو۔ میری لڑائی اب کسی سے نہیں"۔

ایک طرف تاریکی روشنی کو پیروں تلے کچلنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف فاتح مرہٹے لہراتے ہوئے کھیتوں کو۔ اور قلعہ میں چتا بن رہی تھی۔ جیوں ہی چراغ جلے کہ چتا میں بھی آگ لگی۔ ستی چنتا سولوں سنگار کئے اپنے حسن بینظیر کا نظارہ پیش کرتی ہوئی۔ خوشی خوشی آگ کی راہ سے اپنے سوامی کے "لوگ" کی جاترا کرنے جا رہی تھی۔

۸

چنتا کے چاروں طرف عورت مرد جمع تھے۔ حریفوں نے قلعہ کو محصور کر لیا ہے اس کی کسی کو فکر نہ تھی۔ رنج و غم سے سب کے چہرے اداس اور سر جھکے ہوئے تھے۔ ابھی کل

اسی صحن میں شادی کا منڈپ سجایا گیا تھا جہاں اس وقت چتا سالگ رہی ہے وہیں کل
"ہون کنڈ" تھا۔ کل بھی اسی طرح آگ کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ اسی طرح لوگ جمع تھے
مگر آج اور کل کے مناظر میں کتنا فرق ہے! ہاں، مادی آنکھوں کیلئے فرق ہوسکتا ہے۔
مگر دراصل یہ اسی یگیہ کے آخری آہوتی۔ اور اسی عہد کا ایفا ہے۔

دفعتاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی پڑنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کوئی
سپاہی گھوڑے کو سرپٹ بھگاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ ایک لمحہ میں ٹاپوں کی آواز بند ہو
گئی اور ایک سپاہی صحن میں دوڑتا ہوا آپہونچا۔ لوگوں نے متحیر ہوکر دیکھا۔ وہ رتن سنگھ
تھا؟

رتن سنگھ چتا کے قریب جاکر ہانپتا ہوا بولا۔ پیاری میں تو ابھی زندہ ہوں۔ یہ
تم نے کیا کر ڈالا۔

چتا میں آگ لگ چکی تھی۔ چنتا کی ساڑھی سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ رتن
سنگھ پاگلوں کی طرح چتا میں گھس گیا اور چنتا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے لگا۔ لوگوں نے
چاروں طرف سے لپک لپک کر چتا کی لکڑیاں ہٹانی شروع کیں۔ مگر چنتا نے شوہر
کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ صرف ہاتھوں سے اُس کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا
رتن سنگھ سرپیٹ کر بولا۔ ہائے پیاری تمہیں کیا ہوگیا ہے؟ میری طرف دیکھتی
کیوں نہیں، میں تو زندہ ہوں۔

چتا سے آواز آئی۔ تمہارا نام رتن سنگھ ہے۔ مگر تم میرے رتن سنگھ
نہیں ہو۔

تم میری طرف دیکھو تو۔ میں ہی تمہارا خادم، تمہارا عقیدت مند۔ تمہارا شوہر

ہوں"

"میرا شوہر بہادروں کی موت مرچکا"

"ہائے! کس طرح سمجھاؤں۔ ارے لوگو! کسی طرح آگ کو ٹھنڈا کر دیں میں رتن سنگھ ہی ہوں! پیاری! کیا تم مجھے پہچانتی نہیں ہو؟"

آگ کی لپٹ چنتا کے چہرہ تک پہونچ گئی۔ آگ میں کنول کھل گیا۔ چنتا صاف لہجہ میں بولی: "خوب پہچانتی ہوں۔ تم میرے رتن سنگھ نہیں۔ میرا رتن سنگھ سچا سورما تھا وہ اپنی حفاظت کے لئے اپنے اس نکمے جسم کو بچانے کے لئے اپنی چھتری دھرم کو ترک نہ کرسکتا تھا۔ میں جس جوانمرد کے قدموں پر نثار ہو چکی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے بہشت میں رونق افروز ہے۔ رتن سنگھ کو بدنام مت کرو۔ وہ بہادر راجپوت تھا۔ میدانِ جنگ سے بھاگنے والا بزدل نہیں۔

آخری الفاظ نکلے ہی تھے کہ آگ کی لپٹ چنتا کے سر کے اوپر جا پہنچی۔ پھر ایک لمحہ میں وہ حسن کی مورت۔ وہ اعلٰے بہادری کی پوجا۔ وہ سچی ستی۔ آگ میں جل کر بھسم ہو گئی۔

رتن سنگھ خاموشی سے مبہوت سا کھڑا ہوا یہ دردناک نظارہ دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک آہ سرد بھر کر اُسی چتا میں کود پڑا +

جاوید ادو بانی
(عثمانیہ)

Osmania
University